REGD. N. A 466
رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان وہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت
من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہم سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامۃ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ہارون۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط، آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۴۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیز۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت
چار روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالاتِ ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت
پانچ روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دل کش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنسی
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے
نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

۱۹۵۵ء کا سالنامہ

(علماءِ اسلام نمبر)

سال گزشتہ میں نے سالنامہ ۱۹۵۴ء کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "فرمانروایانِ اسلام نمبر" کے بعد میں "علماء اسلام" اور "اماکنِ اسلام" کا سلسلہ شروع کروں گا تاکہ اس طرح رفتہ رفتہ دو چار سال میں "تاریخ اسلام" کا وہ باب جو ترقی علوم و فنون سے متعلق ہے مکمل ہو جائے، چنانچہ اس کا ایک حصّہ "فرمانروایانِ اسلام" آپ کی نگاہ سے گزر چکا اور اب آیندہ سال کے لئے اس سلسلہ کا دوسرا حصّہ پیشِ نظر ہے جو "علماء اسلام" سے تعلق رکھتا ہے۔

اس خاص نمبر میں عرب، ایران، اسپین، مصر، ہندوستان وغیرہ کے ان تمام اکابر علم و ادب کا ذکر کیا جائے گا جنھوں نے کسی خاص فن یا شعبۂ علم کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہے اور کوئی نہ کوئی تصنیف اپنے بعد چھوڑ گئے۔

اس سالنامہ کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خاص لحاظ رکھا جائے گا:-

۱- پورا نام معہ ولدیت وکنیت وغیرہ کے ——— ۲- تاریخ ولادت و وفات سنہ ہجری و سنہ عیسوی کے تطابق کے ساتھ۔
۳- مختصر حالات زندگی اور خاص خاص کارنامے ——— ۴- اہم تصانیف کی فہرست ——— ۵- حوالہ جات جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ تاریخ کی کن کن کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے ——— ۶- ایک انڈکس حروفِ تہجی کے لحاظ سے اور دوسرا علم و فن یا زمانہ کے لحاظ سے۔

اس خاص نمبر میں عہدِ نبوی سے لیکر عہدِ حاضر تک کے تمام ماہرین تفسیر و قرآن۔ ائمۂ حدیث، فقہا، حکماء، اطبا، متکلمین، ماہرین لسانیات و ادب، علماء فلکیات و ریاضیات، طبیعیات و نفسیات، علماء تاریخ و جغرافیہ، سوانح نگاروں اور سیاحوں کا ذکر کیا جائے گا

منیجر

اگر ہ اتک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ مہینہ کے اندر اندر بیڈ بھیجنے میں ہم کو ۴ گنا محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچے کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان میں نگار اور مطبوعات نگار

ان پتوں سے حاصل کیجئے

۱- کتاب محل کراچی
۲- اقبال بک ڈپو کراچی
۳- ہاشمی بک ڈپو - ۱۹۱۰ - الٰہی بخش کالونی، کراچی
۴- کتاب محل راولپنڈی
۵- مکتبۂ جدید لاہور

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ مئی میں ختم ہوگیا اور جون کا
"نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ سنہ ۵۵ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۵	فہرست مضامین مئی سنہ ۵۴ء	شمارہ ۵

ملاحظات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲
قرآن و تفسیر ۔ ۔ ۔ (ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی) ۵
نظامی گنجوی اور سوشلزم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ل ۔ احمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
نیاز کا اسلوب نگارش ۔ ۔ ۔ ۔ محمد خورشید عاصم ۲۳
گاہے گاہے باز خواں (مذہب کا مستقبل) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۸
دعوتِ نقد و نظر ۔۔ پروفیسر عطاء الرحمن ۔ عبد الصمد درد ۔۔۔
پروفیسر مرتاض حسین قریشی ۔ انجم فوقی ۔۔۔ ۴۲
تنوعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۹
منظومات ۔۔ فضا ابن فیضی ۔ ساحر ۔ ساقی جاوید ۔ رضوی ۔ انجم فوقی ۔ ۵۱
مطبوعات موصولہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۴

ملاحظات

شیخ عبد اللہ اور مسئلۂ کشمیر

اس مسئلہ پر مس مردولا سارا بائی (مشہور قومی کارکن خاتون) نے ایک تفصیلی بیان شایع کیا ہے جس سے اُس پس منظر پر کافی روشنی پڑتی ہے، جس سے کشمیر کی موجودہ برسر اقتدار پارٹی اُبھر کر سامنے آئی ہے اور جس نے کشمیر کے مسئلہ کو غالباً زیادہ اُلجھا دیا ہے۔ مس مردولا سارا بائی کے اس مضمون کا ترجمہ معاصر مدینہ نے شایع کیا ہے اور ہم اسی سے یہاں نقل کرتے ہیں :-

چند ہفتے گزرے اس الزامی خبر کو بڑے نمایاں طریقے پر شایع کیا گیا تھا کہ شیخ عبد اللہ نے امریکی ایجنٹوں سے سازش کی ہے۔ اس خبر کا ذریعہ نہیں بتایا گیا تھا۔ بعد میں ایک کتابچہ تقسیم کیا گیا تھا جسے کشمیر میں سازش نامی ایک کتاب کا دیباچہ قرار دیا گیا تھا۔ یہ کتابچہ سرینگر کے سوشل اینڈ پولیٹیکل اسٹڈی گروپ کی طرف سے نئی دہلی میں چھپا تھا۔ اسے کلیانی میں کانگریس سیشن کے دوران نئی دہلی میں ممبران پارلیمنٹ کو اور اخبارات کو بھیجا گیا تھا۔ اس کتابچہ کی طباعت، تزئین اور تقسیم سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کتابچہ کو کس نے چھپوایا اور کون تقسیم کر رہا ہے۔ اس کتابچہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں اخبارات میں اُن کا خلاصہ آچکا ہے۔

میں نے اس بات کی کوشش کی کہ اس کتابچہ کو تلاش کروں مجھے جو پتے بتائے گئے اُن پر میں نے سرینگر خطوط بھی روانہ کئے لیکن یہ سب خطوط اس ریمارک کے ساتھ واپس آگئے کہ مکتوب الیہ کا پتہ نہیں مل سکا ــــ حال میں جب ریاست جموں و کشمیر کے چند ممبران دہلی آئے تو ان میں سے بعض لوگ اس کتابچہ اور اسکے مواد کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ ان کے لئے سوشل اینڈ پولیٹیکل اسٹڈی گروپ کا نام بھی نیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتابچہ غلام محمد میر راجپوری اور منوہر ناتھ نے لکھا ہے۔ یہ دونوں وادیٔ کشمیر میں موقعہ پرست سمجھے جاتے ہیں ــــ بہت پہلے سے میرا خیال تھا کہ ہندوستان کے عوام کی توجہ اس سازش کی طرف مبذول کرادوں جو ہندوستان کی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے کی جارہی ہے، اتنا وقت اس کے متعلق اصل حقایق کو معلوم کرنے میں گزر گیا۔

ایک لحاظ سے یہ مطبوعات دیکھ کر خوشی ہوئی ہے یہ مطبوعات دیکھ کر انگریزی حکومت کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جو ہماری قومی تحریک کے خلاف اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتی تھی۔ کیا ہم سنہ ۱۹۴۲ء میں کاٹوٹن ہام کی لکھی ہوئی مشہور کتاب کو بھول سکتے ہیں جس میں سنہ ۱۹۴۲ء کے توڑ پھوڑ کے واقعات کیلئے

کانگریس کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ اس کتاب کے جھوٹ کا بھانڈا اس زمانہ کے پریس نے کتنی جلدی پھوڑ دیا تھا۔ آج ہمارا پھر امتحان ہے اب تک کسی نے سوشل اینڈ پولیٹکل اسٹڈی گروپ کا نام نہ سنا تھا کہ اچانک یہ نام اخبارات میں آگیا۔ اس گروپ میں کون لوگ شامل ہیں اس گروپ کی تہ میں کس کا دماغ کام کر رہا ہے، اس کو مالی امداد کہاں سے مل رہی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی زبان ویسی ہی ہے جیسی ان کتابچوں کی ہوتی ہے جو ایشیائی ممالک کے اندرونی و بیرونی سیاسی سازشوں کا شکار ہونے والے لیڈروں کے خلاف لکھے جاتے ہیں۔

یہ دلیلیں —! کہا جاتا ہے کہ اگرچہ کتابچہ عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ہے اور غلط بیانیوں اور توڑ مروڑ کر پیش کئے ہوئے واقعات اور حقایق کا مجموعہ ہے تو وہ لوگ جو ریاست جموں، کشمیر میں برسر اقتدار ہیں، وہ کیوں شیخ عبداللہ کے خلاف مسلسل الزامات لگا رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شیخ عبداللہ نے ہندوستان سے غداری کی ہے۔ میں نیشنل کانفرنس کی رکن رہی ہوں اور اُن لوگوں سے جو اب جیل میں ہیں یا جیل کے باہر ہیں میرا گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ حالات میرے لئے انتہائی افسوسناک ہیں۔ یہ سوال صرف ایک شخصیت کا ہی نہیں جس کو سیاسی اقتدار کی سازشوں سے نقصان پہونچا بلکہ اس طریقہ اور ذریعہ کا بھی سوال ہے جو اس موقع پر اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس سے ایسی روایات قایم ہو رہی ہیں جو سارے ہندوستان کے سیاسی مزاج کو بگاڑ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ دیکھنا ہے کہ کیا پرانی دوستی موجودہ تعطل کو دور کر سکتی ہے اور ان دوستوں کو جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں مجتمع کر سکتی ہے۔ کشمیر اب بھی جنگ کا علاقہ ہے اور اگر اسے بین الاقوامی سازشوں سے بچانا ہے تو مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ غرضمند لوگوں نے ابھی تک اس راستہ کے خطرات کو نہیں سمجھا ہے جس پر وہ ایک شخص پر گندے اور گمراہ کن الزامات لگا کر اسے صفائی کا موقع نہ دے کر چل رہے ہیں

اسباب نظربندی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ صاحب کو ان تمام الزامات کی تردید کرنی چاہئے۔ لیکن وہ یہ کیسے کر سکتے ہیں جبکہ پبلک میں ان کو بدنام کرنے کے لئے پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ شیخ صاحب کو اُن کی وجہ نظربندی سرکاری طور پر بتائے جانے کے متعلق بھی شبہ ہے۔ اس شبہ کی بنیاد اس تفصیل پر ہے جو اگست ۱۹۵۱ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے متعلق اخبارات میں شایع ہوئی ہے۔ ان خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرفتاری سے قبل شیخ صاحب کو صدر ریاست کا خط برطرفی کا حکم اور گرفتاری کا وارنٹ سب ایک ساتھ دے گئے۔ ۵ مارچ ۵۳ء کے کشمیر پوسٹ میں نائب وزیر داخلہ شری ڈی۔ پی دھر کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:-

"موجودہ قوانین کے تحت حکومت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نظربند کو وجہ نظربندی سے مطلع کرے یا نظربندوں کے کیس پر حکومت یا کوئی بورڈ غور کرے۔ اب اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس بات کا انتظام کیا جا رہا ہے کہ ہر معاملہ میں خواہ نظربندی کا حکم اس ایکٹ کے نفاذ سے قبل یا بعد میں جاری ہو نظربندوں کو اسباب نظربندی سے مطلع کیا جائے اور انھیں ان احکام کے خلاف اپیل کرنے کا موقع دیا جائے"

تقابل کیوں نہیں کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نظربندوں کو الزامات کی فہرست نہیں دی گئی ہے۔ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ شیخ عبداللہ اپنی صفائی میں کچھ لکھتے کیوں نہیں — اس موقع پر پھر ۱۹۴۲ء کے واقعات کی یاد آتی ہے، جبکہ گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران محلات میں نظربند تھے اور انھیں ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، اکثر خبریں آتی رہتی ہیں کہ شیخ عبداللہ کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں یہ کسی کو صحیح صحیح نہیں معلوم کہ انکو کس قسم کی سہولتیں حاصل ہیں — یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے کہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی جو کتابیں بھی شیخ صاحب کو بھیجی گئیں جیل حکام نے انکی اجازت نہ دی اور تمام پارسل واپس کر گئے۔ نیشنل ہیرلڈ اور ٹریبیون بھی شیخ صاحب کو بھیجنے کی اجازت نہ دی گئی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے جموں اور کشمیر پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کا محکمہ کس طرح کام کر سکتا ہے۔ زیادہ تلاش و تجسس کی ضرورت نہیں۔ ممبر پارلیمنٹ مولانا مسعودی نے جو تار مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو دئے تھے وہ اُن تک پہونچے بھی نہیں اور اکتوبر ۵۳ء کو ان کو بغیر وارنٹ عارضی طور پر گرفتار کیا گیا تھا اور اس طرح اُن کو نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شریک نہیں ہونے دیا۔ حالانکہ اس شرکت کے لئے بخشی صاحب نے خود اُن کو مدعو کیا تھا۔ ایک شخص یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر شیخ عبداللہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے شخص کو لکھیں تو بھی یہ یقینی نہیں کہ مکتوب الیہ کے پاس اُن کا خط پہونچ جائے گا۔ برطانوی دور میں نظربند رہنماؤں کی خبروں کو دبا دیا جاتا تھا۔ کشمیر کے کچھ نامہ نگار جھوٹ اور بیہودگیوں کے تمام ریکارڈ توڑ دینا چاہتے ہیں۔ شیخ صاحب کی پوزیشن مجھے ۴۲ء کی وسیع پیمانہ پر نظربندیوں کو یاد دلاتی ہے۔ کیا ہم نے

یہ اصول نہیں بنا لیا تھا کہ چونکہ نظر بندی صرف حکمرانوں کی جانب سے محض شکوک و شبہات کی بنا پر ہوتی تھی اس لئے ہم میں سے کوئی بھی اس یقین دہانی کے بعد کہ ہم تحریک وغیرہ میں حصّہ نہیں لیں گے۔ پیروں پر رہا نہیں ہوتا تھا۔ ہم اس لئے کرتے تھے کہ حکام کو شکوک و شبہات کی تصدیق کرنے کی کوششوں میں کامیابی نہ ہو اس کو تسلیم کر لینے کا یہ مطلب ہوتا کہ اس بات کا ثبوت بہم پہونچا دیا جائے جس کے بارے میں خود حکومت شبہات میں مبتلا ہوئی ہے۔ بس اگر شیخ صاحب ایسا ہی کریں تو پھر وہ کس چیز کی مذمت کر سکتے ہیں۔ کیا کوئی ذمہ دار شخص ان باتوں کے لئے جو وہ علی الاعلان کہتا ہے وجہ جواز پیش کر سکتا ہے۔ اسلئے حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو جو تحریک آزادی کے دوران ہر قسم کی آزمائشوں اور تجربات کے دور سے گزر چکے ہیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ہم شیخ عبداللہ کی "گمراہیوں" کے بارے میں ان کی جانب سے کچھ سنے بغیر یقین کر لیں۔ اُن کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب کا سب یک طرفہ ہے۔ حتیٰ کہ اس خط و کتابت میں جو اُن کے صدر ریاست یا ان کی کابینہ کے رفیقوں کے درمیان ہوئی اپنے خطوط کی پوری طرح پبلسٹی کی گئی ہے لیکن ان کے جواب میں شیخ عبداللہ نے کیا لکھا اسکا ایک لفظ بھی شایع نہیں کیا گیا۔ میں تفصیل کے ساتھ ان الزامات کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتی جو اس کتاب میں لگائے گئے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمام ہوشیار قارئین اور رائے عامہ بنانے والے صحافی وغیرہ اس کھیل کو سمجھ لیں گے اور اس قسم کے طریقوں کے خلاف آواز اُٹھائیں گے۔ اس کتابچے پڑھنے سے سر دست بہت سے ایسے سوالات سامنے آ گئے ہیں جن پر کافی بحث ہو سکتی ہے مگر یہ بات قومی مفاد میں نہیں ہے شیخ صاحب کو اسمبلی کے سامنے آکر اپنا نظریہ پیش کرنے کا موقع یعنی ایک ایسا حق دیا جائے۔ جو ہر اس شخص کو دیا جانا چاہئے جو کسی جمہوری حکومت میں ماخوذ ہوا ہو اگر یہ قومی مفاد کے منافی ہے جیسا کہ وہ اس کو بتاتے ہیں تو میں قوم کو متنبہ کرتی ہوں کہ یہ بھی قومی مفاد کے خلاف ہے کہ ذمہ دار لوگ اس ناپاک مہم کی روک تھام نہ کریں جو جانے پہچانے عناصر کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ حال ہی میں مشرق وسطیٰ میں جو انقلابات رونما ہوئے ان تمام انقلابات کی یکسانیت ہم کو چوکنا کر دینے کے لئے کافی ہونی چاہئے ـــ سفارتی سازشوں کے طریقے ہمیشہ بڑے عیارانہ ہوتے ہیں۔ کیا تاریخ اس بات کی شہادتیں بہم نہیں پہونچاتی کہ کسی چیز کے "حامی" انجام کار خود سازشی کے معاون ثابت ہوئے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کشمیر میں واقعات کا رُخ موڑنے کیلئے بین الاقوامی قومی اور سفارتی سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کون اس کا حقیقی ذمہ دار تھا اور کون اس کا شکار ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی مہم ہندوستان اور دُنیا کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے چلائی جا رہی ہے لیکن کیا کبھی یہ طریقہ کار کامیاب ہوا ہے، کیا عوام کے محبوب رہنماؤں کو برطانوی حکمرانوں کی جانب سے بدنام کرنے کی کوششیں مفید ثابت ہوئی تھیں؟ کیا اس قسم کی مہم وادی کشمیر کے لوگوں کے زخموں کو بھر سکتی ہے؟

اب وقت آگیا ہے کہ ذمہ داران حکومت یا تو اپنی پوزیشن صاف کریں یا عظیم تر قومی مفاد کے پیش نظر سچائی معلوم کرنے کے لئے معاملہ انصاف کی بارگاہ پر چھوڑ دیں۔ — بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی مہم ہندوستان اور دُنیا کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ لیکن کیا کبھی یہ طریقہ کار کامیاب ہوا ہے۔ کیا عوام کے محبوب رہنماؤں کو برطانوی حکمرانوں کی جانب سے بدنام کرنے کی کوششیں مفید ثابت ہوئی تھیں؟ کیا اس قسم کی مہم وادی کشمیر کے لوگوں کے زخموں کو بھر سکتی ہے؟ — اب وقت آگیا ہے کہ ذمہ داران حکومت یا تو اپنی پوزیشن صاف کریں۔ یا عظیم تر قومی مفاد کے پیش نظر سچائی معلوم کرنے کے لئے معاملہ انصاف کی بارگاہ پر چھوڑ دیں۔ اس وقت ہم لوگوں کو ہندوستان میں بہت ہوشیار رہنا چاہئے۔ ہمیں کشمیر کے لوگوں میں جنھوں نے ہم سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں یہ احساس نہ اُبھرنے دینا چاہئے کہ ہم نے انصاف و معقولیت کی راہ چھوڑ دی ہے۔ — ان لوگوں کو امریکی سازش کا شکار ظاہر کرکے ہم وہاں قائم شدہ نظام کو بھول جاتے ہیں اور اُن لوگوں کی خامیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو آج وہاں برسر اقتدار ہیں یا ان طاقتوں کو فراموش کر دیتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں غیر ملکی مداخلت کی خواہ وہ امریکن ہوں یا برطانوی۔ پاکستانی ہوں یا کمیونسٹ اجازت دی اور آج بھی دے رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ ان مفاد پرستوں نے اور رجعت پسند فرقہ پرستوں نے کشمیر کے معاملہ میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا ہے۔ جس طریقہ سے ان سب لوگوں نے کشمیر کی نئی حکومت کا خیر مقدم کیا ہے اس سے ہماری آنکھیں اس چیز کی طرف سے کھل جانی چاہئیں جو اسکی تہ میں یا اسکے پس منظر میں ہو ان لوگوں نے ہندوستان کے عوام اور رہنماؤں اور ریاست کے درمیان اور خود وادی کشمیر اور دوسرے علاقوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع کیا ہے وہ عوام کے اخلاق و کردار کا معیار پست کرنے اور ایسی مثال قائم کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں جو قومی کردار کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔ لہٰذا ہم سب لوگوں کو ان چیزوں کے قبول کرنے میں بہت محتاط اور خبردار رہنا چاہئے جو کچھ وہ ہم کو دیتے ہیں اور سچائی کی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ریاست میں کیا ہو رہا ہے اور کون سازشی تھے۔

قرآن و تفسیر

از ابتدائے اسلام تا اختتامِ عہدِ بنو اُمیّہ

وحی، رسول اکرم پر چالیس سال کی عمر سے نازل ہونا شروع ہوئی، ابتدا میں ۶ ماہ تک رویائے صادقہ کی شکل میں اور ۶ ماہ کے بعد جبرئیلؑ کے ذریعہ سے اور یہ سلسلہ واقعات و حالات کے مطابق ۶۳ برس کی عمر تک جاری رہا۔ چونکہ درمیان میں تقریباً تین سال تک وحی کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، اس لئے کلام مجید کے نزول کی مدت تقریباً ۲۰ سال مقرر کی جاسکتی ہے۔

جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ اس کو پتھر، ہڈی اور درختوں کی چھال وغیرہ پر لکھوا دیتے تھے اور اسکی ترتیب کے متعلق بھی آپ ہدایت فرما دیتے تھے۔ چنانچہ جملہ آیاتِ قرآنی کی ترتیب رسول اللہ کی ہدایت کے مطابق عہدِ رسالت میں ہوگئی تھی۔ البتہ کل قرآن ایک جگہ مدون نہ تھا۔ علامہ بغوی طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ :۔ "عہدِ رسالت میں چند صحابہ تو ایسے تھے، جنھوں نے چند صورتیں رسول اکرم سے یاد کرلی تھیں۔ اور چند صحابہ ایسے بھی تھے جنھوں نے پورا قرآن حفظ کرکے رسول اکرم کو سنا دیا تھا۔ آخرالذکر صحابۂ کرام میں عثمان بن عفان۔ علی بن ابی طالب۔ ابی ابن کعب۔ عبداللہ ابن مسعود۔ زید ابن ثابت۔ ابو موسیٰ الاشعری اور ابو درداؓ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد کے دوران میں بہت سے حفاظ شہید ہوگئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنگ یمامہ میں سات سو حفاظ شہید ہوئے[1]۔ جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا حفاظ کی کمی کی وجہ سے کلام مجید تلف ہوجائے چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو کلام مجید کے تدوین کا مشورہ دیا۔ آپ نے بہت غور و خوض کے بعد حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ کام مشہور کاتبِ وحی زید ابن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ زید ابن ثابت دیگر کاتبینِ وحی سے اس لئے ممتاز خیال کئے جاتے ہیں کہ "عرضۃ الاخیرہ" میں یعنی جب جبرئیلؑ نے آخری بار رسول اللہؐ کو پورا کلام مجید سنایا اور سُنا تو آپ موجود تھے اور جو آیات منسوخ ہوئیں اور باقی رہیں، اُن سے بھی پورے طور پر واقف تھے۔ گو زید ابن ثابت اس کام کو بہت مشکل خیال کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے قول "لو کلفونی نقل جبلٍ من الجبالِ ماکانہ اثقل علیّ منہ" سے ظاہر ہے۔ یعنی "پہاڑ بھی اٹھانا میرے لئے اس سے زیادہ بھاری نہ ہوتا۔" لیکن جب اس کام کی اہمیت کو خیال کرتے ہوئے اس خدمت کو قبول کرلیا۔ سالم مولیٰ ابن حذیفہ آپ کی مدد کے لئے مقرر کئے گئے۔

زید ابن ثابت نے نہایت جانفشانی سے کلام مجید کو مدون کیا اور یہ مدون کلام مجید حضرت ابوبکرؓ کی تحویل میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی تحویل میں اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کی سپردگی میں آیا۔

امام بخاری نے انس کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں حذیفہ ابن یمان شام سے واپس آئے تو

---

[1] یہ روایت مجروح ہے اور ساقط الاعتبار (نیاز)

انھوں نے حضرت عثمانؓ کو بتایا کہ انھوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مختلف قرأت میں کلام مجید تلاوت کرتے سنا ہے - اگر اسکے تدارک کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہودی اور نصاریٰ کی سابقہ الہامی کتب کی طرح کلام مجید بھی محرّف و مبدّل ہو جائے گا۔ حضرت عثمانؓ نے اس امر کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے تدوین کلام مجید کے لئے ایک بورڈ مقرر کیا۔ جس کے ارکان زید ابن ثابت، عبداللہ ابن زبیر، سعید ابن خاص اور عبداللہ ابن حارث مقرر کئے گئے - اس بورڈ کی مدد کے لئے حفصہ بنت عمرؓ کی تحویل میں جو کلام مجید تھا اُسکو منگوا کر ان کو دیدیا گیا - اس بورڈ کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر کہیں قرأت میں اختلاف پیدا ہو تو قریش کی زبان کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے - اس بورڈ نے نہایت کد و کاش کے بعد کلام مجید کو مدون کیا۔ جس کے مختلف نسخے حضرت عثمانؓ کے حکم سے نقل کئے گئے اور یہ نسخے متعدد مقامات میں بھیج دئے گئے اور یہ ہدایت کی گئی کہ اس کے علاوہ موجودہ نسخے جو اُن ممالک میں رائج ہیں تلف کر دئے جائیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جو کلام مجید کی تدوین کی گئی تھی اس میں سورتوں کو مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ سورتوں کے ساتھ کلام مجید کی تدوین حضرت عثمانؓ کے دور کا کارنامہ ہے -

عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک قرآنی نسخے اعراب سے خالی تھے۔ جب اسلام زیادہ وسیع ہوا تو فاتح اور مفتوح کے باہمی اختلاط کی وجہ سے زبان میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں اور کلام مجید کی تلاوت میں بھی لوگ غلطیاں کرنے لگے - چنانچہ کلام مجید کی تلاوت میں غلطیوں کے ازالے کے لئے عبدالملک کے مشہور عراقی حاکم حجاج ابن یوسف نے جو خود اس زمانہ میں طائف میں معلم تھا کلام مجید کی عبارت پر زبر زیر اور پیش وغیرہ لگوا دئے -

تفسیر

تفسیر سے مراد ہے کلام مجید کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کرنا۔ چونکہ کلام مجید کی زبان اور اسلوب بیان عربی ہے - اس لئے یہ خیال کرنا کہ عرب کا ہر خاص و عام اس کو آسانی سے بخوبی سمجھ سکتا ہے صحیح نہ ہوگا۔ کسی زبان کی کتاب سمجھنے کے لئے زبان جاننا کافی نہیں - بلکہ کتاب کے معیار کے مطابق عقل و فراست بھی لازمی ہے - پھر چونکہ ہر شخص کی عقل و علمی استعداد یکساں نہیں ہوتی - اس لئے کلام مجید کو اجمالاً یا تفصیلاً ہر شخص نہیں سمجھ سکتا - احمد امین مصنف "فجر الاسلام" حضرت عمرؓ کے متعلق انس سے روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر کلام مجید کی آیت "یاخذہم علی تخوف" تلاوت کی - آپ نے تخوف کے معنی دریافت کئے - ایک ھذیلی نے اس کے معنے تنقص کے بتائے اور اپنے بیان کی تائید میں ایک شعر پیش کیا - حضرت عمرؓ کے متعلق ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے کسی نے کلام مجید کی آیت " فاکھۃ و ابا" میں ابا کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ تفصیلی معنوں کے متعلق ممانعت کی گئی ہے - مصنف مذکور نے بد قسمتی سے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا - لیکن اگر یہ دونوں واقعے صحیح مان لئے جائیں تو جب حضرت عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی کا یہ حال تھا تو اوروں کا کیا حال ہوگا؟

اس میں شک نہیں کہ بعض صحابۂ کرام بہ مقتضائے احتیاط کلام مجید کے اجمالی مفہوم پر اکتفا کرتے تھے - اور تفصیلی تفہیم کی کوشش سے احتراز کرتے تھے، چنانچہ اُن کے لئے " فاکھۃ و ابا" کے معنے خداوند تعالے کی نعمتیں - میوے اور چراگاہ کافی تھے -

کلام مجید میں متعدد جگہ اشارات و کنایات سے کام لیا گیا، جن کے سمجھنے کے لئے محض عربی زبان کی واقفیت کافی نہیں ہوسکتی - مثلاً " والعدیٰت ضبحاً - والذّٰریٰت ذرواً یا والفجر ولیالٍ عشرٍ یا لیلۃ القدر" وغیرہ - لیال عشر سے کیا مراد ہے؟ لیلۃ القدر سے کیا مطلب؟ ان سب باتوں کے سمجھنے کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں - اسی طرح کلام مجید میں توراۃ اور انجیل کے واقعات کے متعلق بھی اشارہ اشارہ کیا گیا ہے - اور توراۃ و انجیل کی بہت سی باتوں کی تردید کی گئی ہے، جن کو جاننے کے لئے محض زبان جاننا کافی نہیں ہوسکتا - خود خداوند تعالے کا حسب ذیل قول اس کا شاہد ہے کہ کلام مجید کی بعض آیات تو عام فہم نہیں ہیں - ان کے معنے سمجھنے میں اشکال اور احتمال کی گنجائش ہے - " ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ

آیاتٌ محکماتٌ ھُنَّ اُمُّ الکتاب و اُخر متشابہات ۔ فاما الذین فی قلوبھم زیغٌ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاءالفتنۃ وابتغاءَ تاویلہ ومایعلم تاویلہٗ الاّ اللہ والرّاسخون فی العلم“۔ یعنی خداوند تعالےٰ نے تم پر کلام مجید اُتارا، جس میں کچھ آیات محکمات ہیں (یعنی ایسی آیات جن کے معنی صاف ہیں۔ ان میں احتمال اور اشکال کی گنجائش نہیں) یہی اصل کتاب ہیں اور بعض آیات متشابہات ہیں (یعنی ایسی آیات ہیں، جن میں مختلف معنوں کا احتمال ہوسکتا ہے) جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ و فساد کی خواہش کی وجہ سے متشابہات کی تاویل میں پڑتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تاویل سوا خدا اور فاضل علماء کے اور کوئی نہیں جانتا۔

امام شافعی کے پیرو والراسخون فی العلم پر وقف کرکے یہ معنی خیال کرتے ہیں کہ خدا اور فاضل علماء متشابہات کی تاویل جانتے ہیں لیکن حنفی مذہب کے پیرو راسخون فی العلم پر وقف نہیں کرتے اور اس طرح پڑھتے ہیں ” ومایعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ“۔ یعنی اس کی تاویل سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ماہر علماء بھی صرف یہی کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے اور چھان بین کے جھگڑے میں نہیں پڑتے۔

قرآن کی آیات محکمات زیادہ تر کی ہیں، جو احکام، ہدایات اور تعلیمات پر منحصر ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام وغیرہ۔ اس کا مفہوم زباندان کے لئے سمجھنا آسان ہے۔ لیکن آیات متشابہات کے دقیق معنے تو امام شافعی کے مطابق خدا اور بڑے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اور امام ابوحنیفہ کے مطابق تو آیات متشابہات کے معنی انسانی ناقص عقل اور محدود علم سے بالاتر ہیں۔

کلام مجید کے بہترین مطالب سمجھنے والے حسب مراتب و مدارج صحابۂ کرام تھے۔ یہ خیر القرون کے لوگ تھے۔ خود اہل زبان تھے اور اُن میں اکثر ایسے تھے جو جاہلی ادب اور اس کے نوادرات سے بخوبی واقف تھے۔ جس کی وجہ سے کلام مجید کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان سب اوصاف کے علاوہ سب سے بڑا وصف ان میں یہ تھا کہ رسول اکرم سے بلاکسی واسطے کے فیضان حاصل کیا تھا۔ اور کلام مجید کے اسرار اور تعلیمات سے کلّی طور پر واقف تھے۔ عثمان ابن عفان۔ عبداللہ ابن مسعود وغیرہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اکرم سے دس آیات ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے اور جب تک ان آیات کے علم و عمل سے بخوبی واقف نہ ہوتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ عبداللہ ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سورۂ بقر آٹھ سال میں حفظ کی تھی۔ کیونکہ وہ ہر آیت پورے طریقے سے سمجھ کر یاد کرتے تھے۔ یہ صحابہ کلام مجید کے نزول کے محل، موارد اور ناسخ و منسوخ سے بھی بخوبی واقف تھے۔ کلام مجید کے صحیح معنے سمجھنے کے لئے شانِ نزول کی واقفیت بھی لازمی ہے۔ شان نزول کی ناواقفیت سے غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جارود نے حضرت عمرؓ سے بحرین کے حاکم قدامہ ابن مظعون کی شراب نوشی کی شکایت کی۔ اور اپنے بیان کی تائید میں ابوہریرہ کی شہادت پیش کی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے قدامہ سے کہا کہ میں تم کو سزا دوں گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اُن کے قول کے مطابق بالفرض شراب پیتا ہوں تو اس آیت کے مطابق سزا کا مستحق نہیں۔ ” لیس علی الذین آمنو وعملو الصّٰلحٰت جناحٌ فیما طعموا اذا ما اتقوا (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ ان کے لئے کچھ کھانے میں حرج نہیں بشرطیکہ وہ متقی ہوں“۔ چنانچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ایمان لائے۔ نیک کام کئے اور تقویٰ اختیار کیا میں رسول اکرم کے ساتھ غزوات بدر۔ اُحد۔ خندق وغیرہ میں شریک ہوا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ قدامہ کے اس قول کی کیا تردید ہے؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ یہ آیت گزشتہ لوگوں کے لئے بطور عذر کے تھی۔ موجودہ کے لئے کلام مجید کی یہ آیت ہے۔ ” یاایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجسٌ من عمل الشیطان“۔ یعنی شراب۔ جوا۔ بت اور تیر سے فال نکالنا شیطان کے برے کام ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کی رائے

لہ ایک ایسی کتاب جو اصلاح عامہ کے لئے نازل ہوئی ہو۔ اس میں ایسی آیات کا پایا جانا جو فہم عامہ سے باہر ہوں بالکل بے معنی سی بات ہے۔ صحیفۂ الہامی کی خصوصیت یہی ہونا چاہئے کہ ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ لے۔ نہ یہ کہ اس کے سمجھنے کے لئے خود خدا، رسول یا مخصوص علماء سے پوچھنے کی ضرورت پڑے۔ (نیاز)

سے اتفاق کیا۔

اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص عبداللہ ابن مسعود کے پاس آیا کہ ایک آدمی مسجد میں کلام مجید کی آیت "یوم تأتی السماء بدخان مبین" کی تفسیر یوں بیان کر رہا تھا کہ قیامت کے دن ایک دھواں ظاہر ہوگا، جس سے مسلمانوں پر زکام کا سا اثر ہوگا اور کافر بے ہوش ہو جائیں گے۔ گو عبداللہ ابن عباس سے یہی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ لیکن عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ "جب تک لوگوں کو مکمل علم نہ ہو تفسیر نہ بیان کیا کریں۔ اس آیت کی دراصل یہ تفسیر ہے کہ جب قریش نے رسول اکرم کی بے حد نافرمانی کی تو آپ نے حضرت یوسف کے زمانہ کی طرح سال کے قحط کی بددعا دی۔ جس سے قریش پر ایسا قحط نازل ہوا کہ ہڈیاں تک کھانے لگے۔ جب آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو آسمان اور زمین کے درمیان دھواں سا دکھائی دیتا تھا" صحابہ اُس زمانے کے عرب عادات۔ اقوال۔ افعال اور اقوام سے بھی خوب واقف تھے۔ چنانچہ کلام مجید کی آیات سمجھنے میں بعض اوقات اس واقفیت کی وجہ سے آسانی ہوتی تھی، مثلاً جو لوگ حج کے زمانۂ جاہلیۃ کے رسوم سے واقف تھے وہ حج کے متعلق آیات کو اُن سے زیادہ اچھا سمجھ سکتے تھے، جو اُن رسوم سے ناواقف تھے۔ اسی طرح جو آیات معبودات عرب اور ان کی پرستش کی مذمت میں نازل ہوئیں اُن کو وہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے تھے جو زمانۂ جاہلیت کی بت پرستی سے واقف تھے۔ جزیرۃ العرب کے یہود اور نصاریٰ کے حالات سے واقفیت بھی کلام مجید کے معنی سمجھنے کے لئے ضروری ہے، کیونکہ بعض جگہ کلام مجید میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کی تردید کی گئی ہے۔ چنانچہ جو لوگ ان کے حالات کو جانتے ہیں، وہ ان آیات کے معنی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال صحابہ کلام مجید کی بہترین تفسیر بیان کرنے والے تھے اور اگر ان کے اقوال کی صحت کا کلی یقین ہو جائے تو وہ یقیناً قابل عمل اور قابل قبول ہیں۔ اُن کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے۔

مصادر تفسیر

(۱) تفسیر بالمنقول یعنی وہ تفاسیر جو رسول اکرم سے نقل کی جاتی ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا "صلاۃ العصر صلوۃ الوسطیٰ" ہے۔ یا وہ تفاسیر جو لوگوں کے دریافت کرنے پر آپ نے بیان فرمائی۔ مثلاً حضرت علی نے آپ سے دریافت کیا کہ "یوم الحج الاکبر" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا "یوم النحر" یعنی قربانی کا دن۔ اس قسم کی احادیث منقولہ صحاح ستہ میں بہ ترتیب ابواب درج ہیں۔ تابعین کے زمانہ میں بہت سی حدیثیں گھڑ لی گئی تھیں۔ جن کی بعد کے علماء نے نہایت محنت سے چھان بین کی اور ان کو پرکھنے کے متعدد معیار مقرر کر کے ان کو صحیح یا غلط قرار دیا۔ مثلاً اگر ایک آیت کی دو متضاد تفسیر رسول اللہ سے منقول ہوں تو وہ قابل قبول نہیں۔ مثلاً انس سے مروی ہے کہ کلام مجید کی آیت "قناطیر المقنطرۃ من الذہب والفضۃ" میں قناطیر کے معنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کئے تو آپ نے فرمایا کہ قنطار کا وزن ایک ہزار اوقیہ ہے۔ یہی تفسیر ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قنطار کا وزن ۱۲ ہزار اوقیہ فرمایا۔ اس قسم کی متضاد تفسیر قابل قبول نہیں۔ بعض محققین مثلاً احمد بن حنبل، مغازی کے متعلق تفسیری روایات کو، جب تک کہ ان کی صحت کے متعلق کلی یقین نہ ہو قابل تسلیم نہیں خیال کرتے۔ بہرحال مرور ایام کے ساتھ احادیث منقولہ کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جن میں صحابہ اور تابعین کے منقولات بھی شامل ہو گئے۔

(۲) تفسیر بالاجتہاد یا تفسیر بالرائے۔ یعنی تفسیر کے متعلق اُن لوگوں کی رائے جو عرب کے کلام، عربی الفاظ کے معنی اور شعر جاہلی کے ماہر ہوں۔ اور اسباب تنزیل وغیرہ سے بخوبی واقف ہوں۔ اس قسم کے مفسرین میں عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعود مشہور ہیں۔ گو ان علماء کی تفسیر میں کبھی کبھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور" میں طور کے معنی مجاہد پہاڑ بیان کرتے ہیں۔ عبداللہ ابن عباس، طور سے جبل طور مراد لیتے ہیں۔ اور بعض لوگ طور کے معنے ایسا پہاڑ بیان کرتے ہیں جس پر سبزہ اُگتا ہو۔ بہرحال معنے کے اس قسم کے اختلافات رائے کا نتیجہ ہیں نہ کہ اختلاف منقولات کا۔

تفسیر بالاجتہاد کے متعلق علماء میں اختلاف ہے۔ بعض محتاط علماء کلام مجید میں ذاتی رائے کا دخل پسند نہیں کرتے۔ سعید ابن المسیب سے جب کوئی شخص کلام مجید کے معنی کے متعلق دریافت کرتا تھا تو فرماتے تھے کہ کلام مجید کے متعلق میں کچھ نہ کہونگا ابن سیرین کا بیان ہے کہ میں نے عبادہ سے قرآن کے معنی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور صحیح راستہ اختیار کرو۔ جو لوگ قرآن کے نزول کے بارے میں جانتے تھے وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ عروہ ابن زبیر کہا کرتے تھے کہ میں نے والد کو کلام مجید کی آیت کی تاویل کرتے کبھی نہیں سُنا۔

اس کے برعکس ایسے علماء بھی تھے جو تاویل بالرائے کو جائز اور مباح خیال کرتے تھے اور ان کی رائے کے مطابق جتہاد سے جو باتیں معلوم ہوں ان کا چھپانا درست نہ جانتے تھے۔ لیکن یہ علماء بھی اس بات پر متفق ہیں کہ جن کے علم کے ذرایع مکمل نہ ہوں اور کلام عرب کو اس خوبی سے نہ جانتے ہوں اور کلام مجید کو درسًا درسًا اس طرح نہ پڑھا ہو کہ کلام مجید سمجھنے کی کلی استعداد ہو وہ علماء تفسیر میں دخل نہ دیں اور نہ کسی مذہب مثلاً تشیع یا اعتزال وغیرہ اختیار کرنے کی وجہ سے کلام مجید کی تفسیر اپنے عقیدے کے مطابق بیان کریں۔ عقیدہ کلام مجید کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ کلام مجید کسی عقیدے کے تابع ہو۔

(۳) تورات اور اس کی شروح اور حواشی بھی مصادر تفسیر ہوگئے۔ جب لوگ کلام مجید میں تخلیق عالم یا کسی نبی کے واقعات کے متعلق اشارات پڑھتے تھے۔ تو مزید تفصیل کے خواہاں ہوتے تھے اور اس قسم کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے تورات اور اُسکے حواشی کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ان کے غیر معتبر قول کو بھی پڑھتے اور سنتے تھے۔ اس کے علاوہ یہودی جو مسلمان ہوئے وہ اپنے قصے مسلمانوں کو سناتے تھے جن کو بعض اوقات لوگ قرآن کی تفسیر کو مکمل کرنے کے لئے تفسیر میں شامل کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن عباس بھی کبھی کبھی کعب الاحبار کی صحبت میں بیٹھتے تھے اُن کے اقوال اخذ کرتے تھے۔ حالاں کہ رسول اکرم سے حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "جب تم سے اہل کتاب کچھ کہیں تو تم نہ اُس کو سچ خیال کرو اور نہ اُس کو جھٹلاؤ"۔ باوجود اس کے طبری کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ ان کے اقوال کو تفسیر میں درج کر دیتے تھے، چونکہ ان اہل کتاب کے اس قسم کے اقوال احکام شریعت سے عمومًا تعلق نہیں رکھتے تھے اس لئے مفسرین نے ان کے اقوال کی تحقیقات میں تساہلی اختیار کی۔

تفاسیر میں سب سے زیادہ اقوال علی ابن ابی طالب۔ عبداللہ ابن عباس۔ عبداللہ ابن مسعود اور ابی ابن کعب کے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد زید ابن ثابت۔ ابو موسیٰ الاشعری اور عبداللہ ابن زبیر کے اقوال ملتے ہیں۔ اول الذکر چار حضرات میں وہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ تفسیر پر قادر تھے۔ ان میں یہ اہلیت تھی کہ وہ اجتہاد سے کام لیں۔ اور اجتہاد سے حاصل کئے ہوئے نتائج پر قایم رہیں۔ یہ لوگ عربی زبان اور اس کے اسلوب بیان کے ماہر تھے اور رسول اکرم کی واسطہ صحبت کی وجہ سے ان حالات سے جن کے تحت آیات قرآنی نازل ہوئی تھیں بخوبی واقف تھے۔

اگر کثرت روایات کے لحاظ سے ان حضرات کے اسمائے گرامی کی ترتیب دیجائے تو اول عبداللہ ابن عباس۔ دوم عبداللہ ابن مسعود۔ سوم علی ابن ابی طالب اور چہارم ابی ابن کعب ہیں۔ یہ ترتیب محض کثرت روایات کے لحاظ سے ہے نہ کہ صحیح روایات کے لحاظ سے۔ وضاعین زیادہ تر اپنی روایات عبداللہ ابن عباس اور علی ابن ابی طالب سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جو روایات ان سے منسوب کی جاتی تھیں وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ قبول تھیں۔ عبداللہ ابن عباس خاندان نبوت سے تعلق رکھنے کے علاوہ خلفائے بنی عباس کے جد امجد تھے۔ چنانچہ لوگ خلفائے بنی عباس سے تقرب حاصل کرنے کے لئے روایتیں گھڑ کر اُن کے دادا سے منسوب کر دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی کا حامی بھی ایک گروہ تھا۔ جو اُن کی شان میں بالخصوص اُن کے علم و منزلت کے تفوق کے متعلق روایات گھڑ لیتا تھا۔ مثلاً ابن حمزہ نے حضرت علی سے ایک روایت بیان کی کہ آپ نے فرمایا کہ "اگر میں چاہتا تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد دیتا"

بہر حال ان سب باتوں نے ناقدین کو مجبور کیا کہ وہ روایت کا سلسلہ معلوم کرکے اُن کی جرح و تعدیل کریں اور صحیح و غلط میں امتیاز قایم کریں۔

صحابۂ کرام کے بعد تابعین کا درجہ ہے۔ تابعین میں جو لوگ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں ان میں مجاہد عطاء ابن رباح عکرمہ موسیٰ ابن عباس اور سعید ابن الجبیر بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ یہ سب موالی تھے اور مکہ میں ابن عباس کے شاگرد تھے۔ انکے بھی کثرت روایت اور قلت روایت کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں۔ مجاہد دوسروں کے مقابلے میں ابن عباس سے کم روایت بیان کرتے ہیں۔ مفسرین میں ان کی امتیازی حیثیت یہی ہے۔ اکثر علماء مثلاً شافعی و بخاری وغیرہ ان کو تفسیر میں قابل اعتماد خیال کرتے ہیں۔ لیکن چند علماء ان پر بھی شک کرتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں ذکر کیا ہے کہ لوگوں نے اعمش سے سوال کیا کہ آپ مجاہد کی تفسیر پر کیوں شک کرتے ہیں۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ "وہ تفسیر کے متعلق اہل کتاب سے دریافت کرتے تھے" بہر حال مجاہد کو زیادہ تر علماء قابل اعتماد خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح عطاء ابن رباح اور سعید ابن الجبیر کو بھی اکثر علماء قابل اعتبار خیال کرتے ہیں۔ ابن عباس سے سب سے زیادہ روایات ان کے بربری النسل غلام عکرمہ بیان کرتے ہیں۔ ان کے قابل اعتماد ہونے پر علماء میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کو علم کا بڑا دعویٰ تھا اور کلام مجید کو سمجھنے کا زعم تھا۔ جس کی بنا پر رائے میں جرأت سے کام لیتے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف بعض علماء ان کی علمی قدر و منزلت کے معترف تھے۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ سعید ابن المسیب سے کلام مجید کی آیت کے معنی کسی نے دریافت کئے تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے کلام مجید کی آیت کے متعلق نہ پوچھکر اس سے دریافت کرو جس پر کلام مجید کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے ان کا مطلب عکرمہ سے تھا۔ بہر حال بخاری و دیگر مشہور علماء ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

عبد اللہ ابن مسعود کے مشہور شاگرد ہمدان کے مسروق ابن الاجدع ہیں۔ یہ صادق اور قابل خیال کئے جاتے ہیں قاضی شریح ان سے پیچیدہ مسایل میں مشورہ لیتے تھے۔ دوسرے مشہور شاگرد عربی النسل قتادہ ابن دعامۃ السدوسی ہیں جو کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ یہ نہایت مشہور عربی داں تھے۔ شعر العرب اور ان کے انساب کے خاص ماہر تھے۔ عموماً علمائے ان کو قابل اعتماد خیال کرتے ہیں۔ لیکن بعض علماء ان کے اقوال کو اخذ کرنے میں احتیاط کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو مسئلۂ قضاء و قدر سے شغف تھا۔

تفسیر بیان کرنے کا طریقہ

صحابۂ کرام اور شروع زمانہ کے تابعین کی تفسیر عموماً مختصر الفاظ میں لغوی معنوں کی توضیح تک محدود تھی۔ مثلاً "غیر متجانف لاثم" کی تفسیر "غیر متعرض للمعصیۃ" کردی۔ یا "ان تستقسموا بالازلام" کی تفسیر یوں بیان کردی کہ "زمانۂ جاہلیۃ میں جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تھا تو تیر سے فال نکالتا تھا۔ اگر سفر کی اجازت تیر سے نکلتی تھی تو اس کو سفر میں فایدے کی امید ہوتی تھی اور اگر سفر کی ممانعت کا تیر نکلتا تھا تو اُس کو سفر میں نقصان ہوتا تھا اور مقصد برآری نہیں ہوتی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس قسم کی فال نکالنے کی ممانعت فرمائی"۔ اس کے بعد اگر کچھ اور زیادہ بیان کیا تو شانِ نزول بیان کردی۔ صحابۂ کرام اور تابعین کے بعد کے علماء نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آیت کا ذکر کیا اسکے بعد وہ تفاسیر جو صحابۂ کرام اور تابعین اولین سے منقول ہیں مع اسناد کے بیان کردیں۔ چنانچہ سفیان بن عیینہ۔ وکیع ابن الجراح اور عبد الرزاق وغیرہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح تفسیر بیان کرتے تھے۔ بدقسمتی سے انمیں سے کسی کی تفسیر ہم تک نہیں پہونچی۔ جن لوگوں نے انکے بعد تفاسیر لکھیں۔ اور انکی پیروی کی۔ ان میں ابن جریر الطبری سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ انکے بعد کی تفاسیر میں اسرائیلیات بھی شامل ہوگئیں۔ لیکن فقہی احکامات کے استنباط میں چنداں اثر نہیں ہوا۔ اس کے بعد مختلف فرق ظہور پذیر ہوئے جو اپنے اعتقاد کے مطابق کلام مجید کی تفسیر کرنے لگے — اس میں شک نہیں کہ تفسیر میں علم کی جھلک موجود ہے۔ موضوع تفاسیر بھی علماء کے اجتہاد کا نتیجہ ہے گو اُن کا انتساب حضرت ابن عباس یا حضرت علی سے غلط ثابت ہو۔

(ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

اصغر پر ایک تنقیدی نظر

"اُردو میں اور کچھ ہوا ہو یا نہیں، عاشقی یا شاعری اس دھوم دھام سے ہوئی کہ بس انقلاب زندہ۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے اس ننھے منے مگر شوخ سے جملے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ رشید صاحب جیسا کہ اہل علم واقف ہیں اُردو غزل کے بڑے رسیا ہیں، غزل کو اُردو کی آبرو کہنا چاہے نقاد کے لئے بالکل صحیح نہ ہو مگر غزل کے ایک مہذب دیوانے کو یہی بات زیب دیتی ہے۔

رشید صاحب نے عاشقی کو شاعری قرار دیکر سطحی نقادوں کی عدالت کی بڑی پیاری توہین کی ہے اگر آپ شاعر سے اسکی جوانی کا کس اور اس کی زندگی کا رس مانگ لیں تو یہ ایک کامیاب غزل کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے کچھ اس نقطۂ نظر سے اصغر کی شاعری کو دیکھا ہے اور مجھے اچھی خاصی شرمندگی ہے کہ میں نے اصغر کے ہاں وہ جوانی اور وہ تروتازگی نہیں پائی جو غزل کی "آبرو" ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ شعریت زندگی سے نکھرتی ہے اور زندگی شعریت سے سنورتی ہے۔ شاعر زندگی سے جس قدر قریب ہو کر اور عام انسانی سطح پر آکر گفتگو کرے گا، اس کے ہاں اسی قدر سچائی، حقیقت اور اثر کا پرتو ملے گا۔ اور جوں جوں وہ مادی زندگی اور زمین سے کترائے گا اسی قدر وہ ادب کی راہ میں گمراہ ہوتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی شہادت غالب کے سب سے پرخلوص نقاد حالی کو بھی غالب کی مشکل پسندی پر دینی پڑی۔ چنانچہ اُردو کے دو نامور شاعر جو اس عہد میں شمار کئے جاتے ہیں، بڑی عاجزانہ ہمدردی کے مستحق ہیں، کیونکہ فانی اور اصغر دونوں کو اُردو غزل میں جو اہمیت دی گئی ہے وہ اگر بر بنائے عقیدت ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر گفتگو تنقید کے تحت کی جائے تو میں فانی کی شاعری کو قبر کی شاعری اور اصغر کی شاعری کو قصر کی شاعری کہوں گا قبر اور قصر دونوں کا تعلق ہماری اس مادی دُنیا ہی سے سہی اور دونوں کی حقیقت ناقابل انکار سہی، لیکن یہی وہ دو مقامات ہیں جہاں آدمی زندگی کھو کر پہونچتا ہے اور جہاں جا کے سب کچھ میسر آجاتا ہو مگر زندگی سے ضرور محروم ہو جاتا ہے یہ آدمی تو رہتا ہے مگر مُردہ۔ اس موت سے تو سب ہی واقف ہیں جس کے بعد آدمی کو سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ موت جو آدمی کی زندگی کو بھی مردہ بنا دے اکثر اسی دُنیا میں واقع ہو جاتی ہے اور ایسے چلتے پھرتے مُردوں کے آخری مقام کا نام میرے خیال میں قصر ہے۔ قبر اور قصر دونوں جگہ آدمی پر کیا بیتتی ہے اس کا اندازہ فانی اور اصغر کی شاعری سے چل سکتا ہے۔ قصر کی زندگی میں بڑے نقش و نگار ہیں۔ بڑی چمک دمک ہے۔ اس میں بھی قہقہے ہیں مگر یہ قہقہے خوشی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس میں بھی آدمی جی بھر کر گناہ کرتا ہے، مگر اسے زندگی کی لذت جو زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے، حاصل نہیں ہو پاتی۔ قصر کی زندگی میں عبادت اور ریاضت کے بھی ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ جو گناہوں کے کفارہ کے طور پر کئے جاتے ہیں۔ مگر بے لذت گناہوں کی طرح یہ ثواب بھی اغراض کی آلائشوں سے ملوث رہتے ہیں۔ انفرادیت کے یہ دو مقام جنھیں میں نے قبر اور قصر کہا ہے آدمی کو اس کی جماعت اس کے ماحول اور اس کی مادی دُنیا سے اسے جدا کر دیتے ہیں۔ عاشقی اور شاعری دونوں کا ناتا چونکہ انسان کی زندگی سے ہے اور زندگی عبارت ہے جماعت سے اس لئے شاعر اور شاعری کو جو بھی میسر آتا ہے وہ اسی مادی زندگی سے حاصل ہوتا

ہے۔ چین کے ادیب چیرمین ماؤزے تنگ کے خیال میں ادیب اور فنکار کا خام مواد انسانی جماعت سے قریب رہکر حاصل ہوتا ہے نہ کہ دوری سے۔

اصغر کا یہ پہلو جسے میں نے مُردہ زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا اظہار مختلف نقادوں نے مختلف لب و لہجہ میں کیا ہے۔ چنانچہ غالباً سب سے پہلے نیاز فتحپوری نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ شاعری جس کا تعلق گوشت پوست کے انسان سے ہو اس میں تصوف و روحانیت کا بیان ایسا ہی ہے جیسے کسی ادبی محفل میں کوئی صاحب درود شریف کا ورد فرمائیں اور ثواب دارین بجبر حاصل کرایا جائے۔ نیاز نے اس حقیقت کی طرف اس حیلہ میں ہمیں توجہ دلائی ہے کہ اصغر کی شاعری کا وہ حصہ جو تصوف اور روحانیت سے وابستہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی حصہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ بالکل "درود شریف کا ٹکڑا" معلوم ہوتا ہے۔ نیاز نے اس شاعری کو "جھاڑ پھونک" کی شاعری کہا ہے۔ اُردو کے ایک نوجوان نقاد ڈاکٹر احمد فاروقی نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "ممکن ہے اصغر جوان رہے ہوں مگر ان کی شاعری ہمیں پیرانہ سالی ہی ملی - انکی روحانیت بھی کچھ ویران ہی سی ہے - اور ان کی محبت بھی بے رونق، ان کی تخیل میں رنگینی ہے لیکن جذبات میں گرمی نہیں"

اسی حقیقت کی طرف اور بھی چند نقادوں نے ہمیں متوجہ کیا ہے لیکن بعض نقادوں نے اصغر کی بعض ایسی خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کی بناء پر انھیں اُردو شعرا کی صف میں منفرد قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسن خاں صاحب کا خیال ہے کہ "اصغر کی شاعری پر جدید تنقید کی کمند نہیں ڈالی جاسکتی" موصوف نے اصغر کی شاعری کو "نشاط روح کی شاعری" قرار دیا ہے " ذوقِ نظر کا تحفہ" ہے۔ اُردو غزل " غازہ" ہے۔ اس میں " لطافت ہے رنگ ہے"۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ " معلوم اور نامعلوم کے درمیان جو خلا ہے اسے پر کرنے" کا شرف اصغر کی شاعری کو تفویض کیا گیا ہے۔

جیسا کہ شروع ہی میں میں نے عرض کیا ہے میں کاغذ کے تاج محل سے متاثر نہیں ہوتا۔ مجھے غازہ کی سرخی سے انکار نہیں لیکن صحت مند خون کی سرخی کچھ اور چیز ہے۔ جگر کا خیال ہے کہ اصغر کی شاعری کا وہ حصہ جو زندگی کے ابتدائی تجربوں سے تعلق رکھتا تھا نقادوں کے سامنے نہ آسکا۔ یہ حصہ جو ۲۰ سال سے کم عمر کے زمانہ کا تھا ضائع ہوگیا۔ بیجا نہ ہوگا اگر اس موقع پر اصغر کے ایک قریبی شاگرد مولوی سراج الحق صاحب کے حوالہ سے خود اصغر کا شعری نقطۂ نظر بھی بیان کر دیا جائے فرماتے ہیں "اشخاص اجسام کا تصور مادیات کا عشق اور ان کا ذکر چھوڑئے۔ مجردات کی طرف ذہن کو لے جایئے۔ فسقیہ جذبات اور فسقیہ زبان کو ترک کیجئے۔ مجردات کی شاعری اصل شاعری ہے" میں ان مجردات کے بارے میں کیا عرض کروں ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی گستاخی سرزد نہ ہوجائے، لیکن مولوی سراج الحق صاحب ہی کے حوالہ سے میں حضرت اصغر کا ایک ارشاد نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ تاکہ ان مجرد تصورات کے بارے میں ہم شاعر کے شعور کا کچھ اندازہ کرلیں، فرماتے ہیں " میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میرے منھ سے نکل جائے گا وہ میرے لئے ویسا ہی بیکار اور غیر مفید ہے جیسے میرا فضلہ مجھ سے نکل جائے۔ البتہ جو چیز میرے اندر ہے وہ ہے اصل"۔

اس نقطۂ نظر کے بعد نقاد کی ساری راہیں بند ہوجاتی ہیں، کیونکہ شاعر نے جو کچھ اپنے فکر و ذہن سے " خارج" کیا ہے وہ اصل نہیں ہے اور اصل وہ ہے جو اندر ہے۔ اور اندر کیا ہے ؟ یہ کسی کو باہر سے کیسے معلوم ہو۔

یہ ہے اصغر کا وہ نقطۂ نظر جس نے ان کی شاعری کے بڑے حصّہ کو چوپٹ کر دیا ہے۔ اور وہ شعری صلاحیت کے باوجود اسے ادب کی بھول بھلیاں بنا دیتے ہیں، جہاں نقاد کو قدم قدم پر دھوکا ہوتا ہے۔

اصغر کے اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو منطقی طور پر ان کی ساری شاعری غیر اصل ہوجائے گی۔ لیکن بڑی خوشی

کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہے اور ایسا اس لئے نہیں ہے کہ اصغر کا جو بھی نقطۂ نظر تھا وہ باوجود کوشش کے اسے شاعری میں پوری طرح رچا بسا نہ سکے۔ چنانچہ خود انھوں نے یہ بھی کہا ہے :-

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

جب شاعر کا تعلق مادی زندگی کی آلائشوں اور آرائشوں یا رشید صاحب کے الفاظ میں "مکروہاتِ دنیا" سے برقرار رہتا ہو تب بھی وہ کبھی کبھی صحیح بات کہہ جاتا ہے - اور زندگی کے خالص مادی تقاضوں کے سامنے سربگریباں نظر آتا ہے لیکن اس میں اور ایک باشعور آدمی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے کہتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے اسے سمجھتا اور سمجھاتا ہے لیکن وہ لوگ جو زندگی کی وحدت کو مختلف ذہنی خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں وہ وہ کہتے ہیں جو دیکھتے نہیں اور جو دیکھتے ہیں وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے اسے مانتے نہیں - گویا ان کے ہوش و فکر پر، ان کے قلب و نظر پر اور ان کے ذوقِ شعر پر ایسے غیبی عقیدوں کی چھاپ لگ جاتی ہے - پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ اصغر پر رائے دیتے ہوئے ایک اور پتے کی بات کہی ہے ـــ "مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آجاتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ انکے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو انکا کلام" ـــ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے اصغر نے خود اس کی تردید کی ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے .... کہ اصغر کی تردید غلط ہے رشید صاحب ہی کی شہادت صحیح ہے - یہاں مجھے دنیا کے ایک مشہور انقلابی مفکر کا یہ مقولہ یاد آرہا ہے کہ آدمی اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس کی بنا پر اسے صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسکی کردار کو زندگی کی ٹھوکریں جگاتی ہیں اور مصائب کی آگ میں تپ کر یہ کردار پختہ ہوتا ہے - اصغر کی شاعری میں ہمیں جو تضاد ملتے ہیں اگر خوش قسمتی سے ان کا عقیدہ اس قدر بودا ہے کہ اس کی تردید ہی نے ان کی شاعری کو حسن بخشا ہے اور صرف یہی حصہ ہے جس کا اظہار بہت دلچسپ ہے - اصغر کا زمانہ دو بڑی جنگوں کا درمیانی عہد ہے اور یہی زمانہ حسرت اور فراق کی شاعری کا بھی ہے - اصغر نے جس حد تک زمانہ کے اشارہ کو سمجھا ہے اسی حد تک ان کی شاعری حسین اور رنگین ہے اور جس حد تک انھوں نے اس اشارہ کو نظر انداز کیا ہے اسی قدر ان کی شاعری روکھی پھیکی اور نری "تبرگ" ہے - یہاں پھر اس حقیقت کا دہرانا شاید غلط نہ ہو کہ شاعر کا شعور زندگی سے عبارت ہے - یعنی وہ جس قدر زندگی سے قریب تر ہوتا ہے اس کا حوصلہ بلند ہوتا جاتا ہے - لیکن جوں جوں وہ زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے - خارجی روشنی سے خود کو محروم کر لیتا ہے - حسرت اور فراق نے زمانہ کا ساتھ دیکر زمانے کو چاہے بہت آگے نہ بڑھایا ہو مگر زمانہ نے ان کو اتنا اٹھا دیا کہ ان دونوں کے سر ہمیشہ کے لئے بلند ہو گئے - شعر اندھے کی لاٹھی نہیں ہے کہ خارجی سہارے ہی سے چلے - لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں گہرائی اور بڑائی آتی ہے - خارجی حالات کو پا کر اپنی ذات میں سمو لینے سے میر ہوں یا نظیر، غالب ہوں یا اقبال، حسرت ہوں یا فراق، ان سب کی انفرادیت کا ایک سبب یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے شعور کی آنکھیں اسی فضا میں کھولیں - اور اس کی ترجمانی کر کے اپنی شاعری کے مقام کو بلند کیا - انھوں نے اپنے اردگرد کی دنیا سے آنکھیں بند نہیں کیں - اپنے زمانہ کو سمجھنے کی کوششیں اپنے اپنے شعور کی حد تک کی اور اسی قدر اس میں کامیاب بھی ہوئے - اردو کے نامور شاعروں کو غور سے پڑھئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی ایک مجموعی شخصیت ہے - جن کا شعور ادھورا ہے انکے ہاں شاعری کے اجزاء وہی ہیں جو دوسروں کے ہاں ہیں لیکن ہیں غیر مرتب - لیکن صاحبِ شعور اساتذہ کے ہاں تنقید کی اصلاح میں "روحِ عصر" اسیر ہے - اصغر کے زیادہ اشعار وہ ہیں جن میں ان کی شخصیت ان کے عقیدے اور ان کے زمانہ کے حالات سب نہایت بے ربط اور بے ترتیب ہیں - اور اس کی بنیادی وجہ "روحِ عصر" کا فقدان ہے - یہ خلا سماجی شعور سے پُر ہوتا ہے ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے معلوم اور نامعلوم کے درمیان جس خلا کا تذکرہ کیا ہے اس سے اگر ان کی مراد نا قابلِ معلوم رموز کی طرف ہے

تو یہ درست نہیں ہے۔ اس کائنات میں بعض نامعلوم حقیقتیں ایسی ضرور ہیں جنہیں ہم بتدریج معلوم کرتے جا رہے ہیں علم ہمیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اور علم ہی کا یہ بھی عطیہ ہے کہ بعض معلوم حقایق توہم اور بعض نامعلوم خیال ناقابل معلوم یقین کئے جانے لگے ہیں۔ شاعر جن نامعلوم حقایق تک پہونچ سکتا ہے اور پہونچتا ہے اس کا سامان اس کا سماجی شعور اسے مہیا کرتا ہے اور یہی سماجی شعور اسے بعض اندھی عقیدتوں اور کھوکھلے عقیدوں سے بچا بھی لیتا ہے۔ جیسا غالب کے ہاں ہوا۔ اس لئے اصغر کی شاعری کو معلوم اور نامعلوم کے درمیانی خلا کو پُر کرنے والی شاعری کا کہنا اتنا بڑا دعویٰ ہے جو اقبال اور غالب کے درمیانی عہد میں اقبال و غالب کے سوا کسی اور پر مشکل ہی سے صادق ہو سکتا ہے۔

اصغر کے اشعار میں نہ تو کوئی تاثیر ہے نہ زندگی نہ نامعلوم کی طرف کوئی صحت مند اشارہ ہے۔ نہ معلوم کی طرف کوئی معقول اقدام بس ایک ہکا بکا پن ہے جو ایک دم گھونٹ دینے والی عقیدت اور انتشار خیال کی ضلالت پر مبنی ہے۔ ان میں پریشان کن تحیر ہے نادیدہ خواب کی سی کیفیت ہے ــــــ ملاحظہ ہو:-

صحن حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں ــــــ اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ــــــ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
تھا حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیر ــــــ جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی
حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو ــــــ پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی
میری محرومی کے اندر سے یہ دی اٹھنے صدا ــــــ قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے
اے کاش میں حقیقت ہستی نہ جانتا ــــــ اب لطف خواب بھی نہیں احساس خواب ہے
عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت نہیں، ــــــ تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں
کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا ــــــ خود اپنا طرز نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں،
یہ اقرار خودی ہے دعویٰ ایمان و دیں کیسا ــــــ ترا اقرار جب ہے خود سے کبھی انکار ہو جائے
حُسن کے فتنے اُٹھے میرے مذاقِ شوق سے ــــــ بس سے میں بے چین ہوں وہ خود میری آواز ہے
جہاں ہے کہ نہیں جسم و جاں بھی ہے کہ نہیں ــــــ وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں
خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر ــــــ جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرز نظر ہے
مجاز کیسا کہاں حقیقت ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے ــــــ یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے کچھ خبر نہیں ہے
کیا تماشا ہے کہ سب ہیں اور پھر کوئی نہ ہو ــــــ اس کی بزم ناز بھی خلوت سرائے راز ہو
عکس جمالِ یار کا آئینۂ خودی میں ہے ــــــ یہ غم ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا،

ان اشعار میں اگر تصوف کی کوئی رمزیت ہے تو خیر ورنہ ان کی حقیقت خود اصغر ہی کی زبان میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ:-

ابھی تو آپ خود کہتے ہی خود تنہا سمجھتے ہیں

موجودہ نفسیات نے افکار اور اظہار کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ تجزیہ یہ بھی کیا ہے کہ شاعر اظہار مدعا کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیتا ہے ان میں سے بعض اس کی ذہنی کیفیات کی مکمل نمایندگی کرتے ہیں۔ مثلاً میر کے ہاں کارواں اور قافلوں کا بار بار اشارہ ایک خاص شعور کا ترجمان ہے۔ غالب کے ہاں حوصلہ اور شوق، نظیر کے ہاں "یار" اور "بابا" ایک خاص سمت کا پتہ دیتا ہے۔ فانی کے ہاں "جنازہ اور کفن"۔ اسی طرح اصغر کے ہاں "عکس اور طرز نظر" سے ان کے ذہنی افق پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

شروع میں اس کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ اصغر کے ہاں داخلی شاعری کے تقریباً سب اجزا کم و بیش موجود ہیں۔ لیکن خاصے منتشر اور کافی بے جوڑ۔ ان اشعار سے جن میں خود انھوں نے اپنی شاعری کے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس کی کوئی ایک شہادت بھی فراہم نہیں کی جا سکتی۔ ایک طرف تو ان کا یہ خیال تھا کہ ؎

اصغر غزل میں چاہئیے وہ موجِ زندگی — جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجایش نہیں فریاد و ماتم کی

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیئے، — مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی،

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ اُلفت بن، — یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں،

اصغر نے اس موجِ زندگی اور رنگینیٔ جوشِ تخیل کا اظہار اگر اپنے ابتدائی کلام میں کیا ہو جس کے بارے میں حال ہی میں حضرت جگر مراد آبادی نے مجھے مطلع کیا تو اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ ان کے دونوں مجموعے سرودِ زندگی اور نشاطِ روح، محض نام کی حد تک اس جذبہ کے ترجمان ہیں۔ ورنہ ان میں تصوف اور معرفت کی بھول بھلیاں قدم قدم پر ناقد کا راستہ روک لیتی ہے۔ غزل کے غلط روایتی ماحول اور گھٹی گھٹی فضا کی یہ برکت ہے کہ خود اصغر جیسے طربیہ شاعر نے بار بار اپنی تردید آپ کی اور نغمۂ رنگینی کو بھلانے یا بھول جانے کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف ان کو یہ بھی کہنا پڑا کہ ؎

وہ نغمۂ رنگیں میں اب بھول گیا اصغر — اب گریۂ خونیں میں رودادِ گلستاں ہے

ابھی یہ طرزِ مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے — نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

مجھ میں نوائے عشق کے رنگینیاں نہیں — سوزِ خموشِ عشق ہوں سازِ بیاں نہیں

اصغر کے ہاں یہ خموشی یہ بے خبری یہ محویت کا عالم جسے بھونچکا پن کہنا شاید غلط نہ ہو کافی چھایا ہوا ہے اور گریۂ خونیں کا جزو بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچیں — نگہباں چیخ اُٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی،

ان کی طرزِ نظر والی شاعری سے میل نہیں کھاتا۔ اسی طرح ان کے ہاں سر جھکانے والے اشعار بھی کم نہیں۔ مثلاً :-

تصویر ہے کھنچی ہوئی راز و نیاز کی، — میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

اصغر کی صرف ایک خصوصیت قابلِ توجہ ہے۔ یعنی ان کی شاعری کا وہ جزو جسے روحانیت سے تعبیر کرنا سخت بدذوقی ہے اور جسے دلوں کی افسردگی اور زندگی کی پژمردگی کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں اصغر زمین ہی پر رہ کر شاعری کرتے اور آسمان سے تارے نہیں توڑتے۔ عام زندگی پر نظر ڈالتے ہیں :-

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں — اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب — وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

کائناتِ دہر کیا روح الا میں بیہوش تھے — زندگی جب مسکراتی ہے قضا کے سامنے

حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں — ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

یہ مجھ سے سُن لے تو رازِ نہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں — کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُر خطر نہیں ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اس جہانِ غیر میں آرام کیا راحت کہاں — لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اسکو
یہ جانِ ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

یہ دین ہے وہ دنیا یہ کعبہ وہ بت خانہ
اک اور قدم بڑھ کے اے ہمتِ مردانہ

دیر و حرم بھی منزلِ جاناں میں آئے تھے
پر شکر ہے کہ بڑھ گئے دامن بچا کے ہم

مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے
کہ ذرہ ذرہ میں ہے اک جہانِ نامشہود

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے
لباسِ زہد کو جس نے کیا شراب آلود

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

پرتوِ رخ کے کرشمے تھے سرِ راہگزار
[illegible]

کچھ سمجھ کر ہم [illegible]
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھئے

موسمِ گل کیا ہے اک جوشِ شبابِ کائنات
پھوٹ نکلا شاخِ گل سے حسنِ عریاں دیکھئے

ان اشعار میں اصغر کے ہاں وہ زندگی ملتی ہے جو ارضیت سے جنم لیتی ہے۔ یہاں سے اصغر کے شعور میں ایک صحت مند تبدیلی کی روشنی نظر آتی ہے۔ اور پھر وہ ان اشعار میں اسی مادی زندگی کی حقیقت اور انسانیت کی سطح پر آکر انسان سے انسانوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں انسانی پیار، آدمی کی سی چمکار اور آدمی کی سی چاہت ہے۔ رعنائی اور توانائی سنگھار کرکے مچل رہی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ان میں بڑا پیارا کفر ہے۔ ایسا حسین اور رنگین کفر جس سے ٹکرا کر اصغر کا سارا تصوف اور مجردات کا تصور پاش پاش ہو جاتا ہے۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

مے دافعِ آلام ہے تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

عارضِ نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آگیا
ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

جانبازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

اٹھے عجب انداز سے وہ جوشِ غضب میں
چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

ہستی کے آب و رنگ کی تعبیر کچھ تو ہو
مجھ کو فقط یہ خوابِ زلیخا نہ چاہئے

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

خوشا حوادثِ پیہم خوشا وہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

میری فغانِ درد پہ اس سرو ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

صہبائے خوشگوار بھی یارب کبھی کبھی
اتنا تو ہو کہ تلخیِ غم بے مزا نہ ہو

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

کبھی گل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم ان رخ پر
کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں

سید رضی الدین احمد۔ ایم۔ اے

نظامی گنجوی اور سوشلزم

نظامی گنجوی کی آٹھ سودیں یادگار کا سال تو ۱۹۴۱ء تھا لیکن اس پر ریسرچ کا کام برسوں پہلے سے ہو رہا تھا۔ سوویٹ یونین کے ادارۂ شرقیات (Institute of Orientology) کی شاخیں ہر وفاقی جمہوریت کے صدر مقام میں قایم ہیں۔ چنانچہ ادارۂ شرقیات کی تاشقندی (ازبکستان) شاخ نے علماء و ماہرین کی ایک جماعت کو نظامی پر تحقیق و تدقیق کے لئے مامور کیا تھا اس اہم علمی جستجو کے لئے تاشقند کو غالباً اس بناء پر مرکز بنایا گیا کہ مشرقی علوم سے متعلق قلمی نسخوں کا بہت ذخیرہ وہاں فراہم ہے۔

ماہرین کی اس جماعت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تصانیف نظامی کے تمام نسخے جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے تھے جہاں سے بھی دستیاب ہو سکتے تھے، اصل یا بصورت نقل ان کو حاصل کیا۔ پھر ان کا مقابلہ کر کے غلطیوں کی اصلاحیں کیں۔ لندن کے برٹش میوزیم میں چودھویں اور پندرھویں صدی کے لکھے ہوئے مخطوطے ہیں، ان کی فوٹو کاپیاں منگوائی گئیں اور بالآخر نظامی کے جملہ کلام کا ایک مستند نسخہ مرتب کر لیا گیا اور پھر ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ روسی اور دیگر سوویٹ زبانوں میں ترجمہ ہو کر نہایت اہتمام سے شایع کیا گیا۔

اس تلاش و تحقیق میں نظامی سے متعلق بہت سا ایسا مسالا دستیاب ہوا جس کا پہلے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا نظامی کے فلسفۂ حیات کے متعلق نئے زاویے معلوم ہوئے اور نئی معلومات کی روشنی میں نظامی کی شاعری پر گہری نظر ڈالی گئی نظامی کے عہد اور اس عہد کی زندگی کو سمجھا گیا۔ اور اسی طرح نظامی کی ادبی و شعری صناعت کی صحیح قدر مقرر کی گئی۔

اس مطالعہ نے ثابت کیا کہ نظامی جبر و استبداد کا دشمن اور عوام الناس کا دوست تھا۔ اسی لئے نظامی کو درباداری سے ہمیشہ نفرت رہی اور وہ معاشی بدحالی میں مبتلا رہا۔ حالانکہ جاگیر داری عہد میں ہنروروں اور اہلِ کمال کو اکٹھا کر کے دربار سجائے جاتے تھے اور اگر وہ چاہتا تو اُس کے لئے بھی اس عہد کے ہر دربار کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ مگر نظامی نے دولت و راحت کے مقابلہ میں اپنی ذہنی آزادی کو محبوب رکھا۔ چنانچہ ان تبصرہ نگاروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نظامی نے زندگی پر حکیمانہ نظر ڈالی اور اسے ترقی پسندانہ نظر سے دیکھا۔

قدیم مورخوں نے نظامی کا سال وفات متعین کرنے میں غلطی کی تھی۔ اس نئی جستجو سے ثابت ہوا کہ وہ ۱۲۱۱ء تک زندہ تھا آرمینیا کے مستقر شہر باکو میں نظامی چوک ہے جہاں ایک عالیشان عمارت کے اندر نظامی میوزیم قایم کیا گیا ہے۔ اس میوزیم میں نظامی کی تصویر بھی آویزاں ہے۔ یہ میوزیم اپنے نوادر کے ذخیرے کے لئے مشہور ہے۔ آذربیجان کے اس قومی شاعر کے عہد اور زندگی سے متعلق قدیم کلچر و صناعت کی بہت سی یادگاریں فراہم کی گئی ہیں۔ نظامی کے اشعار اور منظوم واقعات کے بہت سے نقوش ہیں جو سوویٹ صناعوں کی قلمکاری کا نتیجہ ہیں۔ اسی مجموعۂ نقوش میں خان زادہ کی بنائی ہوئی وہ مقبول عام تصویر بھی ہے جس کا عنوان ہے "سکندر فلسفی کی خدمت میں"۔

آذربیجانی مصنف رفیلی نے ۱۹۳۹ء میں "نظامی" نام سے ایک تصنیف شایع کی تھی جو اپنے موضوع پر سند کا درجہ حاصل

کرچکی ہے۔ نظامی کی جو قدر و منزلت سوویٹ عہد میں ہوئی اس کا سب سے بڑا ثبوت پروفیسر برتیل کے مقالے کا یہ فقرہ ہے:-

"سوویٹ یونین میں مختلف قوموں کے ادب کی جو تاریخ مرتب ہو رہی ہے اس میں ایک خاص باب نظامی کے لئے وقف ہوگا اور اس میں ان قوموں کے ادب پر بھی نظر ڈالی جائے گی جہاں جہاں شعرِ نظامی کا اثر پہونچتا تھا"

پوری سوویٹ یونین کے اہلِ قلم کی ایک یونین ہے جس کے کلب سوویٹ یونین کے ہر مرکزی شہر میں قایم ہیں۔ ان کلبوں میں بالعموم کسی نہ کسی موضوع پر ایک "شام" منعقد کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر سال ایک "شام" نظامی گنجوی کی برسی کے دن بھی ہر کلب میں منائی جاتی ہے اور نظامی کے فن و صناعت پر بحثیں ہوتی ہیں۔ سیکڑوں مقامات پر ہر سال یہ مخصوص اجتماع ہوتے رہنا بجائے خود ایک اہم بات ہے!

آٹھ سو سال کی یہ تقریب سوویٹ یونین کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی منائی گئی مگر اس تقریب کا مرکز آذربیجانی جمہوریت تھی، آذربیجانیوں نے اپنے عظیم المرتبت شاعر و مفکر کی یادگار جس جوش اور شان سے منائی، اس نے علم و فضل کی دُنیا میں غلغلہ بپا کر دیا۔

سوویٹ نظامی کو بڑے بلند پایہ کا مفکر و معلم مانتے اور اسے ایک غیر فانی ہستی باور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیس کرور انسانوں کا محبوب ہیرو بن گیا ہے! بحیرۂ بالٹک کے ساحل کی تین سوویٹ جمہوریتوں سے نظامی کا تعارف دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔

الغرض، اس تحقیق و تلاش کے علاوہ جو ادارۂ شرقیات میں برسوں سے ہو رہی تھی، اس خاص موقع پر سوویٹ ملک کے طول و عرض میں ہزارہا اخبار اور رسالوں میں بے شمار مقالے، تبصرے اور افتتاحیہ مضامین شایع ہوئے، بے گنتی لکچر ہوئے، سیکڑوں ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے اور ان سب میں نظامی کے ادب اور اس کے فلسفۂ حیات کو اُجاگر کیا گیا۔

سوویٹ نقادوں کا فیصلہ ہے کہ نظامی کے شعر و صناعت، اس کے محامد و محاسن اس کے صناعانہ زور و قوت اور اس کی تعلیمی و اخلاقی قدروں کو امتداد زمانہ نے کسی پہلو سے کم نہیں کیا، بلکہ ان میں اور اضافہ کر دیا ہے! اور اس کی وجہ ان کی رائے میں نظامی کا مسلک انسانیت پرستی ہے! نظامی کے آفاقی تصورات و تخیلات انسانی دلوں کے اندر آج بھی گونج پیدا کر رہے ہیں! ان نقادوں کا عقیدہ ہے کہ نظامی کا پیغام ہر زمانہ کے انسان کے لئے تھا! نظامی ہر چند سامنتی سماج میں پیدا ہوا، جبر و تعدی کے دور میں جیا، لیکن ہمیشہ ایک پر مسرت زمانہ کا خواب دیکھتا اور یقین کرتا رہا کہ وہ عہدِ خرم آرہا ہے! ایک سوویٹ صحافی لکھتا ہے کہ:-

"حیرت اس پر ہے کہ نظامی نے جس سماج کا تصور قایم کیا تھا اس کی وہ 'یوٹوپیا' ہمارے اشتراکی سماج سے مشابہ تھی" نظامی حقیقتاً انسان کو اشرف المخلوقات باور کرتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ اس نے وقارِ انسانیت کو ہر موقع پر برتر و مقدم رکھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ عوام الناس کو آزادی و مسرت کی کتنی شدید آرزو ہوتی ہے!

ایک ناقد لکھتا ہے:-

"نظامی اگر آج مقبرے سے نکل آئے تو اسے نظر آئے گا کہ اس کی قوم دوسری سوویٹ قوموں کے ساتھ ساتھ انسانی آزادی کا پرچم لہرا رہی اور دنیا میں غلامی و تشدد کے خلاف جنگ آزما ہے!"

نظامی نے غلامی کے قورمہ و متنجن سے آزادی کی نانِ جویں کو بہتر کہا ہے۔ مگر یہ نقاد نظامی کے اس خیال میں ترمیم چاہتا اور کہتا ہے کہ:- "آزادی اور خود اختیاریت کے لئے لازمی نہیں کہ نانِ جویں ہی کھائی جائے! سوویٹ قومیں اپنی آزادی کی مدافعت کرنے کے لئے ساتھ ساتھ زندگی کی تمام نعمتیں افراط سے پیدا کر رہی ہیں!"

یہ ایک جغرافی حقیقت ہے کہ نظامی آذربیجان کے علاقہ میں پیدا ہوا اور وہ علاقہ آج سوویٹ علاقہ ہے، لیکن سوویٹ لوگ نظامی کو "اپنا" محض اس لئے نہیں کہتے، اس کی قدر و منزلت مجرد اس لئے نہیں کرتے، بلکہ اسے "اپنا" اس بنا پر سمجھتے اور کہتے ہیں کہ نظامی کا پیغام سوویٹ اشتراکیت سے ملتا جلتا ہے، اس کا اولین خاکہ ہے! نظامی جس اخوت کی تعلیم دیتا ہے، جس انسانی مساوات کی تلقین کرتا ہے، وہ اخوت و مساوات سوویٹ قومی بھائی چارے میں صورت پذیر ہے؛ ایک مقالہ نگار لکھتا ہے :-

"سرزمین آذربیجان نے نظامی کو جنم دیا اور نظامی کی قوم بلا شبہ اپنے قدیم و آفاقی کلچر کی سچی وارث ہے۔ آذربیجان کا کلچر اکثر قوموں کے کلچر کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہے۔ نظامی کی غیر فانی شاعری، شکسپیر کی شاعری سے چار سو سال پہلے کی ہے، اس بنا پر آذربیجانی قوم، اور تمام سوویٹ قومیں اپنے کلچری ورثے پر جس قدر فخر و ناز کریں بجا ہے!"

سوویٹ علم دوستی کے نقطۂ نظر سے نظامی کی قدر و منزلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو نظامی کے یہاں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ انسان کائنات کا آقا ہے! آج یہ کھلی حقیقت ہے کہ سائنس کی قدر کرنے میں سوویٹ قوم کو دنیا کی تمام قوموں پر فوقیت حاصل ہے، اور اگر یہ قوم علم و فن کی گرویدہ نہ ہوتی تو اس کا نظام حکومت ہرگز اتنا مستحکم نہ ہوتا جتنا کہ ہے۔ اس بات سے بھی انکار کرنا مشکل ہے کہ علم فن اسی سماج میں آزادانہ ترقی پا سکتے ہیں جہاں انسان کی مشقت آزاد ہو، جہاں نسلی و قومی تفریق کی حدیں نہ کھچی ہوں۔ سوویٹ کلچر یا دوسرے لفظوں میں حقیقی انسانی کلچر کی برتری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے نہایت پس ماندہ قوموں کو وہ نظر و فہم عطا کی کہ یہ قومیں نظامی کی سماجی اہمیت، اس کے جوہر انسانیت پرستی اور اس کے اندر انسانی قدروں کو دیکھ اور سمجھ سکیں اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نظامی روسی سوشلزم کا ہراول تھا!

عجیب حسن اتفاق تھا کہ نظامی کا یہ یادگاری دن اور انقلاب روس کی تیسویں سالگرہ کا دن ایک ساتھ آیا، اس عجیب حسن اتفاق نے نظامی کے یادگاری جشن میں چار چاند لگا دئے۔ ایک سوویٹ نقاد نے بہت خوب کہا ہے کہ :-

"نظامی کی یہ یادگاری تقریب اگر انقلاب روس کے تیس سال بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے پڑتی تو بہت کم لوگوں کو خبر ہو پاتی اور بہت کم لوگ دلچسپی لیتے!"

ایک نقاد کا اندازہ ہے کہ نظامی کے بعد کے زمانہ میں، اس پورے علاقے میں جہاں فارسی زبان رائج تھی، خمسہ نظامی کی تقلید میں کم و بیش ایک ہزار خمسے لکھے گئے، اور یہ نظامی کی نقل کرنے والے دنیائے ادب کے محسن تھے کہ اس طرح انھوں نے نظامی کی عمر طویل کر دی!

پروفیسر برٹیل نے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس تقریب کے موقع پر جو مقالہ پڑھا، اس میں اس نے یہ بھی بتایا کہ دنیا میں آج سے پہلے نظامی کی جو قدر و منزلت ہوئی وہ صحیح بنیاد پر مبنی نہ تھی۔ برٹیل کہتا ہے :-

"مغربی یوروپ نظامی کو صدیوں سے جانتا تھا۔ گیٹے نے آسٹروی مستشرق ہمیر پرگستال کے ترجمے کے ذریعہ سے نظامی کا مطالعہ کیا اور اس کے شعر کی داد دی تھی۔ روس کے اندر بھی آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے نظامی کی منتخبات اصل اور ترجمے کی صورت میں متعارف تھے۔ مگر مغربی یوروپ کے علماء اسی عام غلطی کا شکار ہوئے اور نظامی کو ایرانی شعراء کے زمرے میں شامل کر دیا اور ایسا محض اس دلیل پر کیا کہ نظامی نے فارسی زبان میں اظہار خیال کیا تھا۔ حالانکہ خود نظامی کے کلام سے ثابت ہے کہ وہ آذربیجانی تھا"

"بعض مستشرقین نے اس کو قم کا باشندہ بتایا ہے جو ایران کا ایک شہر ہے اور ثبوت میں نظامی سے منسوب ایسے شعر دئے ہیں جن کا الحاقی ہونا اس سے ثابت ہے کہ وہ اشعار پندرھویں صدی سے پہلے کے کسی نسخے میں نہیں ہیں۔"

دوسرے سوویٹ نقادوں نے اس خیال کی سخت تنقید کی ہے اور اس کو بورژوا نقطۂ نظر کہا ہے کہ نظامی ایک افسانوی شاعر اور محض حسن وعشق کا مغنی تھا۔

برتیل نے اپنے اسی مقالے میں استدلال کیا ہے کہ فارسی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا اس بات کی قطعی دلیل نہیں ہوسکتا کہ نظامی باعتبار قومیت ایرانی تھا۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وسطی زمانوں میں شمالی قفقاز سے لے کر وادی گنگا تک علمی و ادبی زبان فارسی تھی۔ بالکل اسی طرح یوروپ میں ایک مدت تک روما کے اہل قلم یونانی زبان میں ہی تصنیف وتالیف کرتے رہے تھے۔ برتیل لکھتا ہے :۔

"نظامی کے شعری ذخیرے میں اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ اسے آذربیجان سے کتنی وابستگی تھی۔ شیریں خسرو کا فسانہ برداع (Bardaa آج جمہوریہ آذربیجان کا حصہ ہے) کے ہر خاص وعام کی زبان پر تھا۔ خسرو کی زندگی کے جتنے واقعات بیان ہوئے ہیں ان کی جائے وقوع آذربیجان کی سرزمین ہے۔ فرہاد (جس کے معنی مضبوط کے ہیں) کے باکو آنے کی روایت آذربیجانی عوام کی ملکیت تھی۔ چوتھی مثنوی میں نظامی نے ساسانی بادشاہ بہرام گور کو ہیرو بنایا ہے مگر بہرام گور صرف ایران ہی میں نہیں ورائے قفقاز میں بھی اتنا ہی ہردلعزیز حکمراں تھا۔ سکندر اعظم کی ثنا خوانی بھی نظامی نے بے وجہ نہیں کی۔ اس نے سکندر کی زندگی کے جتنے واقعات بیان کئے ہیں ان سب کا تعلق سرزمین آذربیجان اور کوہستانی قفقاز سے ہے۔ شیریں خسرو کے مناظر بھی تمام تر اور خالصتہً آذربیجانی ہیں"

"ایک خاص نکتہ یہ بھی ہے کہ نظامی کے کردار بین الاقوامی ہیں یعنے اس کے ہیرو مختلف قوموں اور ملکوں کے نمایندے ہیں۔ نظامی کے وقت کا آذربیجان فی الواقعہ بین الاقوامی تھا۔ وہاں کی آبادی مختلف النسل وقوم لوگوں پر مشتمل تھی۔

"پھر نظامی نے ایسے ہزاروں لفظ استعمال کئے ہیں جو آج بھی آذربیجانی زبان کا جزو ہیں۔ بیسیوں ضرب الامثال جو نظامی نے استعمال کی ہیں، وہاں آج بھی بولی جاتی ہیں۔"

برتیل کی رائے ہے کہ یہ تمام باتیں اتفاقی نہیں بلکہ مقصدی اور اس بات کی شہادت ہیں کہ نظامی کو اپنے وطن کی چیزوں سے گہرا لگاؤ تھا۔

آذربیجانی ادیب عزیز شریف کہتا ہے کہ شاہ شیرواں نے نظامی کے پاس لیلےٰ مجنوں کا افسانہ نظم کرنے کی فرمائش بھیجی اور ساتھ ہی لکھوا دیا کہ وہ فارسی زبان میں ہو، کیونکہ ترکی زبان میں وہ لوچ اور نفاست نہیں ہے جو شاہی درباروں کے ذوق کا ساتھ دے سکے۔ نظامی نے اس فرمائش کی تعمیل تو کی مگر اسی میں اپنی ناراضگی بھی ظاہر کردی۔ تعمیل کیوں کی؟ اس کا سبب آگے بیان ہوگا۔

جس عہد میں نظامی کے یہ غیر فانی شہکار تخلیق ہوئے، وہ زمانہ آذربیجان کے اقتصادی عروج کا زمانہ تھا۔ شہر گنجہ کی بنیاد جو نظامی کی جائے پیدائش ہے، نویں صدی عیسوی میں پڑی تھی اور نظامی کے عہد میں۔ گنجہ سیاسی، اقتصادی اور کلچری مرکز کے مرتبے کو پہونچ چکا تھا۔ کاروانی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے گنجے کا بہت بڑی تجارتی منڈی بن جانا لازمی بات تھی اور حکومت کا مستقر ہونے کے سبب سے صنعت وتجارت ترقی پذیر تھی، اس، اس لئے دولت کی فراوانی تھی، اور اسی وجہ سے صناع اور اہل حرفہ دور دور سے کھچے چلے آتے تھے۔

لیکن یہ آباد و سرسبز گنجہ ۱۲۳۵ء کے تاتاری سیلاب میں تباہ ہوکر چند میل کے فاصلہ پر دوبارہ آباد ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نظامی کا مقبرہ آبادی سے کچھ فاصلے پر پڑ گیا۔

علاقۂ آذربیجان آج دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی آذربیجان سوویٹ یونین کی وفاقی جمہوریہ کی شکل میں ہے اور

جنوبی حصہ مملکت ایران میں شامل ہے۔ نظامی کے عہد میں پورا آزربیجان ایک وحدت تھا، جہاں یکے بعد دیگرے مختلف خاندانوں نے حکمرانی کی۔ عہد نظامی میں سلجوقی خاندان کی حکومت تھی۔

آزربیجان کی کلچری روایات بہت شاندار ہیں، ایک مدت تک علم و فضل اور فن و کمال کا مرکز بنا رہنے کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ اس زمانہ کے مشرق میں آزربیجانی کلچر ہی برتر مانا جاتا تھا۔ فنِ تعمیر کے عالیشان نمونے جو اسوقت تک محفوظ رہ سکے ہیں، چینی، دھات اور مٹی کے برتن جو دستیاب ہوئے ہیں، اُس عہد کے صناعتی اور شعری گنجینے ہیں اور سیاحوں کے بیان اور شہادتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ اس زمانہ نے یورپ کے مقابلہ میں بھی آزربیجان کلچری اعتبار سے بہت آگے تھا، علم و فن بہت ترقی یافتہ اور بدتر تھا۔

قدیم آزربیجان کی ترقی تیزی سے ہوئی۔ لیکن اس کلچری ترقی اور اقتصادی خوش حالی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اس سماج کے ادنیٰ طبقے بے چین تھے، لوگ بغاوت اور سرکشی پر آمادہ تھے، غیر انسانی حکمرانوں کے علم و استبداد سے اہلِ فن و کمال بھی محفوظ نہ تھے۔ نظامی سے پہلے اور بعد بھی، بلند پایہ شاعر و ادیب زندان یا جلاوطنی کی زندگی کرتے تھے یا قتل کردئے جاتے تھے۔

نظامی عوام کا دوست اور حامی تھا، اس کی شہادت خود نظامی کے کلام سے مل جاتی ہے، اس کے ہیرو اور دوسرے کردار زیادہ تر محنت کش انسان ہی تھے! کوئی سنگتراش ہے تو کوئی غلام، کوئی چرواہا ہے تو کوئی دستکار۔ فارسی زبان بولنے والے نہیں ہیں نظامی پہلا ادیب ہے جس نے درباری ادب کے اندر ادنیٰ طبقے کے انسانوں کا ذکر کیا جو ایک بہت بڑی بدعت اور سخت قسم کی روایت شکنی تھی!

تاریخ نے نظامی کے حالات زندگی محفوظ نہیں کئے، مگر سوویت نقادوں نے خود اس کے کلام سے نظامی کی زندگی کے کچھ حالات فراہم کئے ہیں۔ نظامی کے باپ کا نام یوسف تھا اور وہ گنجہ کا قدیم باشندہ تھا۔ نظامی نے اپنی ماں کو ایک کرد خاتون لکھا ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد حصول معاش میں ماں کا ہاتھ بٹانے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ سراغ البتہ نہیں ملتا کہ نظامی کی تعلیم کہاں اور کیونکر ہوئی، البتہ خود اس کے کلام سے ثابت ہے کہ اس زمانہ کے معیار کے مطابق نظامی کو اعلیٰ قسم کی تعلیم ملی۔ عربی و فارسی پر پورا عبور ہونے کے ساتھ فلسفۂ الہیات، کیمیا، نجوم، طب اور ریاضی میں بخوبی درک ہونا ثابت ہے۔ نظامی کی زندگی کے متعلق نہایت ناکافی معلومات کی بنا پر یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی اہم اور سنگین واقعات و حادثات سے معرا رہی۔ خمسۂ نظامی تقریباً ایک لاکھ اشعار پر ہے اور اس کے مطالعے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس کی ذہنی یا روحانی زندگی غیر معمولی طور پر مطمئن تھی۔

۱۱۷۰ء یعنی تیس سال کی عمر میں نظامی نے شادی کی۔ اس کی بیوی کا نام آفاق تھا۔ آفاق کو کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کنیز تھی جو تحفتاً نظامی کو بھیجی گئی تھی۔ نظامی کو آفاق سے گہری محبت ہو گئی تھی۔ آٹھویں سال اس کا بیٹا محمود پیدا ہوا، مگر آفاق جانبر نہ ہو سکی۔ بیوی کی موت کا نظامی کو سخت صدمہ ہوا۔

مثنوی خزینۃ الاسرار، نظامی نے بیوی کے انتقال سے چند ہی روز پہلے مکمل کی تھی۔ اس مثنوی کو زور بیان کا اعلےٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ نظامی نے اپنا عزیز و محبوب خواب اسی مثنوی میں سنایا ہے۔ بیس مکمل نظموں میں شاعر نے حیات انسانی سے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ ہر فصل ایک حکایت پر ختم ہوتی ہے اور وہ حکایت موضوع نظم کی تائید اور اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

رواج عام کے مطابق نظامی نے اس مثنوی کو شاہ فخرالدین بہرام شاہ سے معنون کیا ہے۔ اسی طرح بعد کی مثنویاں کسی نہ کسی شاہ و امیر سے معنون ہیں۔ سوویٹ نقاد اس نوع کے تحفے سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ نظامی کو اپنے خیالات و افکار سے حکمراں اور

اہلِ دربار کو روشناس کرانا مقصود تھا تاکہ شاہ و امیر اپنا منصب اور رعایا کی قدر و اہمیت سمجھ کر حق و انصاف پر عمل پیرا ہوں۔

آفاق کی موت کے بعد نظامی نے اپنا لافانی شہکار "شیریں خسرو" نظم کی۔ سوویٹ نقادوں کی نظر میں یہ مثنوی اس محبت کی شاندار یادگار ہے جو نظامی کو آفاق سے تھی۔ تمام مشرقی ملکوں میں شیریں خسرو پہلی افسانوی شعری تصنیف تھی جس نے نظامی شہرت و مقبولیت کو معراج پر پہونچا دیا۔

شاہ شیرواں کی فرمایش تھی کہ لیلیٰ مجنوں کی مثنوی فارسی ہی زبان میں لکھی جائے، نظامی نے اسے خودداری کے خلاف سمجھا اور فرمایش کو مسترد کر دینا چاہا، مگر اس کے بیٹے محمود نے اصرار کیا کہ باپ منظور کرلے۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی کہ محمود کو شاہی دربار میں رسائی ہو جانے کی سخت آرزو تھی۔ محمود کو بھی شعر شاعری سے لگاؤ تھا اور باپ کو بیٹے سے محبت بھی تھی۔

حُسن اور عشق کا یہ غیر فانی قصیدہ مثنوی لیلےٰ مجنوں چار مہینے میں مکمل ہوگئی اور اسے محمود خود لے کر شاہ شیرواں کے دربار میں پہونچا۔ درباری داری سے نظامی کی نفرت اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے، ورنہ وہ خود بھی جاکر پیش کر سکتا تھا۔

شاہ شیرواں نے محمود کو اپنے چھوٹے بیٹے کا مصاحب و مقرب بنا دیا۔ لیکن محمود وہاں دس سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور گھر واپس آگیا۔

مثنوی ہفت پیکر، لیلےٰ مجنوں کے آٹھ سال بعد مکمل ہوئی۔

نظامی کی صناعت شعر نے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ بالعموم تاریخی تھے، اور اس پہلو سے نظامی اور شکسپیر میں بڑی مماثلت ہے، ان دونوں نے جس تاریخی موضوع کو چھولیا وہ غیر فانی شاہکار بن گیا۔ ہفت پیکر نظامی کے پورے کلیات میں سب سے زیادہ قنوطی اور پر مسرت مثنوی ہے۔ تخیل کا تموّل، تصورات کا حُسن اور نفسیات انسانی کا گہرا مطالعہ اور اس کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے ساتھ گہرے تعلق کا اظہار، اس مثنوی کی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث وہ اس قدر مقبول ہوئی۔

سکندر نامہ، نظامی کی آخری تصنیف ہے اور آخر حصۂ عمر میں لکھی بھی گئی۔ اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نظامی کے فن و صناعت کا مکمل ترین نمونہ سکندر نامہ ہے اور اس کے فکر و خیال کی پختگی کا مستند آئینہ بھی ہے نظامی نے انسانی مسرت کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس کا فلسفۂ حیات اس مثنوی میں پوری طرح بیان ہوگیا ہے۔

سوویٹ نقادوں کا مطالعہ یہ ہے کہ نظامی کو دُنیا کے اندر انسانی نابرابری نے ساری عمر بےچین رکھا۔ مسایل حیات کو حل کرنے میں اس نے پوری زندگی صرف کردی۔ زندگی کے یہ مسایل جن کا حل نظامی تلاش کر رہا تھا، انسانی سماج میں اس کے تضاد و تخالف سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ سکندر نامہ میں نظامی نے ایک عادل حکمراں کی (آئیڈیل) تصویر پیش کی ہے جو بیکوقت بادشاہ بھی ہے اور فلسفی بھی۔ ایسے حکمراں کو نظامی نے اس پوری نظم میں حق و انصاف کے محافظ کی شکل میں پیش کیا ہے، جو بالآخر ایک ایسی دُنیا بسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس میں بندگی و خواجگی مفقود ہے اور انسانوں میں کوئی اونچا یا نیچا، چھوٹا یا بڑا نہیں۔ ہر آدمی مطمئن و مسرور ہے۔

نظامی کے ہم قوم و وطن عزیز شریف نے توضیح کی ہے کہ اپنی یہ نئی دُنیا بسانے کے لئے نظامی نے جو حصّۂ زمین منتخب کیا تھا، جغرافیائی اعتبار سے وہ شمالی علاقہ ثابت ہوتا ہے۔ نظامی کا یہ اشارہ دراصل ایک پیشگوئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے وطن نظامی کے شمال میں اور پھر خود آذربیجان میں حقیقی آزادی و مساوات کا خواب پورا ہوا۔

(خدا اور اخلاق صاحب نیاز)

ل۔ احمد

فلاسفۂ قدیم — اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔ (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ (۲) مادئین کا مذہب
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے — قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول
مینجر نگار لکھنؤ

نیاز کا اسلوبِ نگارش

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

دُنیا کی تقریبًا اڑھائی ارب آبادی میں شاید ہی دو انسان ایسے ہوں جو آپس میں کلّی مناسبت و مشابہت رکھتے ہوں۔ یہ طبائع، عادات اور بہ حیثیتِ مجموعی شخصیتوں کا اختلاف رنگا رنگئی عالم کا باعث ہے۔ ادب جو زندگی کا آئینہ دار اور جذبات کا عکّاس ہے۔ طبائع کا تفاوت اس میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے ایک مخصوص رنگ کا مالک ہوتا ہے۔ ہر شاعر کا شعر اور ہر نثر نگار کی نثر، اگر بہ نظرِ امعان دیکھا جائے تو دوسروں سے مختلف دکھائی دیتی ہے۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ وغیرہ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں۔ حالیؔ۔ شبلیؔ۔ محمد حسین آزادؔ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر ایک جداگانہ عظمت و وقار رکھتے ہیں۔ ایک کا اسلوب دوسرے سے الگ ہے اور یہ چیز ہم عصر ہونے اور ایک ہی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود ظہور پذیر ہوتی ہے۔

ٹی ایس۔ ایلیٹ کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ "ہم ادب سے ادیب کی شخصیت کا پتہ چلا سکتے ہیں" اسی مطلب کو ابوالفضل نے انشا کے دفترِ سوم میں بڑی خوبی سے ادا کیا "خویشتن را از نقش تا بہ نقّاش باید رسانید"۔ ظاہر ہے کہ ادب۔ کا بغور مطالعہ کرنے سے ادیبوں کی متحرک شخصیتوں، ان کے احساسات، جذبات، مطمحِ نظر، معیار ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ادیب کے اُسلوبِ بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ادیب کی عبارت رنگین ہوتی ہے، کسی کی سادہ، کسی کی تحریر رواں ہوتی ہے۔ کسی کی سُست۔ کسی کے اسلوب میں ایک ولولہ و ہنگامہ ہوتا ہے اور کسی کے ہاں نرمی و سکوت، کہیں تشبیہات و استعارات کا زور دکھائی دیتا ہے اور کہیں محاورات و ضرب الامثال کی بھرمار نظر آتی ہے بعض جگہ کسی وصف کی افراط ہے اور بعض جگہ تفریط اور بعض مقامات پر حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بالارادہ نہیں ہوتا، یہ طبعی چیز ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جو چاہتا محمد حسین آزادؔ کی نثر اور غالبؔ کے سے شعر لکھنے پر قادر ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلوب یا انداز الفاظ میں نہیں بلکہ بیان کرنے والے کی شخصیت میں پنہاں ہوتا ہے، جیسے محمد حسین آزادؔ نے کہا ہے "انھیں اوصاف سے سوداؔ سوداؔ اور میر تقیؔ میر صاحب ہیں، ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ لے۔ خالی سودا ہے تو جنون ہے اور خالی میرؔ ہے تو گنجفہ کا محض ایک پتہ"[1]

"اسٹائل کا مادہ یونانی لفظ (STILUS) ہے نہ کہ STYLUS سے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نوکدار آلہ کسی دھات یا لکڑی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا۔ جس کے ذریعہ سے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھایا جاتا تھا خود ان نقوش یعنی جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور ایک عمل جو ابتداءً میکانکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ ان نقوش کو اسٹائلس کے دوسرے کُند حصے سے سدھارا جاتا۔ ادب میں یہیں کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے وہ اپنا جائزہ لیتا ہے اور غور کرتا ہے کہ جو کچھ اُسے کہنا تھا کہہ سکا اور حقیقت کا جو نقش اُس کے دل میں مرتسم تھا وہ تحریر میں بلا کم و کاست

---

[1] آبِ حیات ص ۳

منتقل ہو گیا کہ نہیں۔ اسی دیدہ ریزی پر کسی پارۂ ادب کی خوبیوں اور نوک پلک سے درست ہونے کا انحصار ہوتا ہے ...؟ [1]

اسلوبِ بیان ہر مصنف ادیب یا شاعر کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ لکھنے والے کی شخصیت جن احساسات، جذبات اور خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان کی جھلک ایک ایک لفظ ایک ایک فقرے اور بیان کی تمام اداؤں میں موجود ہوتی ہے۔ ادب میں زندگی اور حرارت، خونِ جگر کے بغیر نا ممکن ہے۔ اور خونِ جگر صرف اس صورت میں ادب میں منتقل ہو سکتا ہے۔ جب ادیب کا حقیقی احساس اور جذبۂ صادق الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو جائے۔ یعنی ہر نیا لفظ اور ہر نیا فقرہ یا مصرع شخصیت کی گہرائیوں سے اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آئے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم ادب کو ادیب سے علٰحدہ نہیں کر سکتے اور جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ادب کے عناصر معلوم کریں تو لازماً ہمیں ان عناصر کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے جن سے ادیب کی انفرادیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ احساس اور جذبۂ ادب کی اساس ہیں۔ ہر ادیب کے احساسات وجذبات مختلف ہوتے ہیں۔ جو چیزیں ایک کے نزدیک محبوب ہوں ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا لگاؤ رکھے۔ یہ اختلاف قدرتی طور پر اسٹائل میں بھی اختلاف پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ہر ادیب یا شاعر کی اپنی شخصیت کی تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ اُس میں ابتدائی زندگی تعلیم و تربیت، احباب اور متعلقین کی شخصیتیں، سیر و سفر اور مطالعہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، لکھنے والے کی شخصیت میں جس قدر وسعت، جس قدر عمق اور جس قدر پیچیدگی ہوگی۔ اس کا اسلوب اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اتنی ہی زیادہ وسعت اور گہرائی کا حامل ہوگا۔ اور اس کے زاویے اتنے ہی زیادہ متنوع اور مختلف ہوں گے۔

انھیں اصول کو سامنے رکھتے ہوئے، جب ہم نیاز کی نثر نگاری اور ان کے اسلوب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے نثر نگاروں کی نثر سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی خود نیاز کی شخصیت دوسروں کی شخصیت سے متفاوت ہے۔ نیاز کے خیالات، اُن کے اندازِ فکر اور طبعی رجحانات پر گزشتہ مضمون میں کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ دھندلے سے نقوش ایک دھندلی سی تصویر ہمارے روبرو لا رکھتے ہیں جس کی مدد سے ہم پوری طرح نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ نیاز کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر اُن کے اسلوب کو سمجھنے پر بھی قادر ہو سکتے ہیں۔

سب سے بڑی چیز جو ہمیں محسوس ہوتی ہے، وہ نیاز کی تشکیکیت ہے۔ وہ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و پریشان ہیں۔ اُن کی طبیعت میں ایک اضطرابِ مسلسل ہے اور خلجانِ لا متناہی، یہی پیچ و تاب اور یہی سوز و ساز ان کی طبیعت کا بڑا اہم جزو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ احساسات میں ایک تحرک ہے اور جذبات میں تموج۔ نظر دور دور تک پہونچتی ہے۔ مگر کہیں نہیں ٹھیرتی۔ دماغ سوچتا ہے، لیکن یہ عمل بھی بہت سریع ہے۔ یہ تیز روی اور اضطراب ہی انھیں سکون و راحت سے صحیح طور پر لذت اندوز ہونے کے قابل بناتا ہے۔ جنھوں نے خزاں کے ستم نہیں اٹھائے وہ بہار کی قدر و قیمت کیا جانیں۔ جنھوں نے موجوں کے تھپیڑے نہیں کھائے وہ ساحل کی عافیت بخشی سے کماحقہ کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں، نیاز کی یہ بے سکون طبیعت مواقع راحت کو خوب پہچانتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ حسن، جوانی، خوشبو، بہار، برسات سبزہ، ساحل، سمندر، محافل، رقص و سرود وغیرہ کا ذکر وہ ڈوب کر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صحرا گزیدہ کسی شیریں اور شفاف چشمے پر پہونچ گیا۔ اس بے سکونی اور تلاشِ سکون کا تصادم و اختلاف ان کے طرزِ اسلوب کا خلاق ہے۔

ان کی اس طبعی جولانی و بے قراری سے ان کی عبارت میں روانی اور بہاؤ بہت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں عبارت

---

[1] اقبال اور اندازِ بیان اختر لکھنوی روزنامہ امروز ۱۲ اپریل ۱۹۵۳ء

ناہموار ہوگئی ہے۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی یہ صفت اور خاصیت شروع سے آخر تک جاری و ساری دکھائی دیتی ہے۔ خواہ وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں یا ناول تحریر کر رہے ہوں، کوئی خط قلمبند کر رہے ہوں یا مذہب پر بحث و تمحیص ہو رہی ہو، عبارت اُسی طرح رواں ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ روانی اپنے اندر ایک ہنگامہ رکھتی ہے۔ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تند و تیز مواج دریا ہے۔ جو پہاڑوں سے ٹکراتا، کہیں آبشاریں بناتا، کہیں دلآویز نغمے الاپتا کہیں سرسبز وادیوں اور خوش رنگ پھولوں کو آئینہ دکھاتا اور کہیں اپنے کناروں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نیازؔ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں اور خیالات و جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے، جس کا مقابلہ ہر صاحبِ قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن نیازؔ اس پر قادر ہیں، وہ جس تیزی کے ساتھ سوچتے ہیں اور جس طرّاری سے خیالات اُن کے سامنے آتے ہیں۔ اسی سرعت اور اسی افراط سے وہ حوالۂ قلم کرنے پر قادر ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح لکھ بھی دیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو شاید ہی کبھی یہ گمان ہوا ہو کہ عبارت اُن کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ یا اُن کے الفاظ تشنۂ مطالب ہیں، بلکہ بعض اوقات تو اُن کے قلم کی روانی اور جولانی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مطالب عبارت کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ کولرج کے نزدیک "مشکل باتوں کو آسان طریق پر نثر میں بیان کر دینا بہت بڑا کمال ہے"۔

اس روانی کے ساتھ ساتھ نیازؔ کے اُسلوب میں ایک دلکشی بھی ہے۔ اس دلکشی کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ ان کی رومانیت پسندی ہے، جو شاید ان کے طبعی اضطراب اور بے سکونی کے ردِعمل سے پیدا ہوئی تھی۔ جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ بعض اوقات لکھتے لکھتے کھو جاتے ہیں اور دُور اپنے رنگین خیالات کی وادیوں میں محوِ سیر و تماشا نظر آنے لگتے ہیں۔ نیازؔ کا لکھا ہوا کوئی منظر خواہ وہ بمبئی کا ساحل ہو یا حیدر آباد کی کوئی دل نواز شام یا روہیلکھنڈ کی کوئی پہاڑی ہو یا کسی مصریِ زبیدہ کا تذکرہ ہو یا بارش، کہسار، سمندر، سبزہ زار، طلوعِ آفتاب و مہتاب وغیرہ کا بیان ہو، ان چیزوں کا ذکر ان کی تحریر میں ایک ولولہ پیدا کر دیتا ہے وہ اس بیان میں ایک کیف اور مستی محسوس کرتے ہیں۔ بالخصوص عورت، اُس کا حسن اس کی محبت، اُس کی جوانی، اُس کا لباس اور پیکر ان کی رومانی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ عورت کا معاملہ من حیث مجموع ان کے ہاں بہت حسین پیچیدگیوں اور پیچیدہ حسن آفرینیوں کا حامل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کی عظمت، اس کی اہمیت اور اس کے زندگی بخش وجود کو کماحقہ نہیں سمجھ سکے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس کی دل نوازیوں اور جاں آفرینیوں کے قصیدہ خواں ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عورت گلشنِ رنگ و بو ہے اور ہستی کے دھڑکتے ہوئے دل کی راحت، لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے متعلق اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، اسے اور بھی زیادہ اچھی طرح سمجھنے کی خواہش ان کے دل میں موج زن ہے۔ اور پھر زیادہ الفاظ میں، بسیط تر ذکر اور بیان کے ذریعہ وہ اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ جو داد وہ عورت کو دیتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ اور مخلصانہ کیوں نہ ہو تاہم ان کے دل کو تسکین نہیں ہوتی، اُنھیں اس سے زیادہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ ان کے پاس الفاظ ہیں، لیکن اس احساس کی بے پایانی کا کیا علاج کہ ہر لحظہ ایک نیا رنگ ہے اور ہر رنگ میں ایک نئی ترنگ۔ یہی عناصر مل جل کر ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں، یعنی عبارت میں ایک دلکشی اور دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:-

"ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شرابِ زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی اور سطحِ آب پر سے سایہ کی تاریکی جو مشرق کی جانب سمٹی جا رہی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہو کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے"[1]

---

[1] نگارستان صفحہ ۱۱

" وادیِ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفانِ عریانی بپا تھا۔ فرطِ تعطر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں چاند، چادرِ سیمیں پھیلا کر اس پر اُتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ لبس کر رہ گئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور حباب گھونگرو کے دانے، جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پر ہنگامِ رقص نکل کر رہ گئے ہیں، اگر دُرِ آب یا دشتِ نیلوفر میں جو کلی کہیں کھل کر رہ گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناہیدِ فلک کا بُت کسی شوالے میں رکھا ہے۔"[1]

" کل سے بارش ہو رہی ہے اور یہاں کی وادیاں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمرد حل کرکے بھر دیا گیا ہے۔ ہوا کا ہر ہر جھونکا خم کے خم لئے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں۔ مینہ کا ہر ہر قطرہ نغمۂ جان سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں۔"[2]

" تمام کائنات پر ایک سکونِ مطلق طاری تھا۔ جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی۔ متحرک امواجِ آب میں نشرِ ضیا کا وہ عالم تھا، گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لئے پانی میں اُتر آئی ہیں۔"[3]

" چاند بلند ہو کر تمام سطحِ آب پر ایک روشن تھرتھری، ایک منور ہلچل پیدا کر چکا تھا۔ لیکن لہروں کا خرامِ ناز ایک ایسا خرام خاموش تھا جس کو ساری نگاہیں تو دیکھ سکتی تھیں لیکن سامعہ کے لئے کوئی آواز ایسی نہ تھی جس کو ہلکی موسیقی سے بھی تعبیر کر سکیں۔ چاند کی کرنیں۔ نہایت آزادی کے ساتھ پانی سے کھیل رہی تھیں۔ تمام سطحِ آب پر بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں اور کوئی دامن اس چاندنی کو جمع کرنے والا نہ تھا۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا۔ اور اپنی متین اور سنجیدہ رفتار کے ساتھ نصف آسمان تک پہونچ کر معلق نظر آنے لگا۔ ہوا چل رہی تھی لیکن اس قدر نرمی و نزاکت کے ساتھ کہ درختوں کی پتیاں بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکتی تھیں اور چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی اپنی جگہ آسودہ نظر آ رہا تھا۔"[4]

جہاں تک عورت اور اس کی خوبیوں کے بیان کا تعلق ہے۔ نیاز کی مذہبی قسم کی تحریروں کو چھوڑ کر باقی تمام تحریریں اور مضامین سے رنگین ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، نیاز حسن کے فریفتہ و دلدادہ ہیں اور ان کے ہاں تمام کائنات کے حسن کا نچوڑ اور تمام عالم کی رعنائیوں کا عطر اور تمام اوصاف کا ہیولیٰ اگر کوئی چیز ہے تو وہ عورت ہے۔ شروع کی تحریریں بالخصوص لبریز کیف و مستی ہیں۔ نیاز کے رومانی افسانوں کی جان، انھیں پرتاثیر بنانے والی قوت، ان میں شعریت و رنگینی کی کیف آگینی شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے تغنے نے ان کے ہر لفظ کو، ہر جملے کو، ہر قصے کو رومانی و رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ نہ تمام افسانوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں اور نہ بہت سی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت۔ تاہم بطورِ نمونہ چند ایک سطور نقل کی جاتی ہیں:-

" اپنی دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطمِ نور، ایک سیلابِ رنگین، ایک طوفانِ حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت، تمام نازک ترین خصوصیاتِ نسائی لئے ہوئے دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔"[5]

---

[1] مکتوبات حصۂ اول ص۱۱۱ - [2] مکتوبات حصۂ اول ص۱۱۱ - [3] مکتوبات حصۂ اول ص۱۱۱ - [4] جمالستان ص۱۲۱ - [5] ہمارے افسانے ص۱

"خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے لوگ خدا جانے کیا بے سر و پا دلائل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ آپ خود غور کیجئے "چمبیلی اور گلاب کے افشردہ کو منجمد کر کے اس سے ایک مجسمۂ حسین طیار کرنا، اس کی رگ رگ میں آتشِ سیّال دوڑا دینا اور کمر کی دونوں طرف کا بلور نکال کر سینہ میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت دونوں، بجلی کی منفی و مثبت رَو کی طرح دیکھنے والے کو مسحور کر لیں، سوائے خدا کے کوئی اور کر سکتا ہے؟ باور کیجئے یہ جی چاہتا تھا کاش میں ذرۂ خاک ہو کر اس کی راہ میں پڑ جاتا اور وہ پامال کرتی گزر جاتی"[۱]

"وہ یونان کے اس عہدِ زرّیں کا مجسمہ تھا۔ جب مقصدِ فطرت صرف حسن کا پیدا کرنا تھا اور اس کے ساتھ پرستاریِ حسن کو عام کر دینا۔ ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی چمپئی رنگ کی مورت، سر سے لیکر پاؤں تک لوچ ہی لوچ۔ اعضا کے لحاظ سے سراپا تناسب و موزونیت۔ ہر ہر ادا سے نشہ بخش و سحر انگیز۔ ہئیات کے اعتبار سے یکسر برقِ جوالہ، تاثرات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی اور محبّت کی پذیرائی میں ہمہ تن درد۔ آہ۔ کراہ"[۲]

"صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزالِ رعنا پیدا نہیں کر سکا اور نہ سرزمینِ شام نے ایسی سیاہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے۔ جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا۔ اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہِ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے۔ جس میں بیک وقت تکبر بھی ہے اور شراب بھی، جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی پلکیں، جن کی ہر جنبش بحالتِ التفات رگِ جان ہے، اور بصورتِ عتاب نوکِ سنان۔ اس حریر سے بنائی گئی ہیں، جسے نازنینانِ روما کی نرم اور لچکیلی انگلیاں طیار کرتی ہیں"[۳]

"اس کا رنگِ جسم یہ معلوم ہوتا تھا، انسترنِ زارِ فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگِ شفق ملا کر بلوری جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے جو ابدیت کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے"[۴]

"اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک ایسا عمیق چشمہ تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور مادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی ...."[۵]

"حُسن عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور ایک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو یا جنسِ لطیف میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے۔ فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حُسن ہی اس کا متجسس ہو جمال ہی اس کی جستجو میں سرگرداں ہو، جس طرح نزاکت کا بار اٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، نازک بیلوں پر ایک تتری ہی بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک حسین صبیح پیشانی پر کچھ صندل ہی کا قشقہ لطف دیتا ہے معدنی اشیاء

---

[۱] جمالستان صہ۱۱۲ - [۲] جمالستان صہ۴ - [۳] جمالستان صہ۲۳ - [۴] مذاکراتِ نیاز صہ۹ - [۵] نگارستان صہ۲

میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے۔ وہ یہ منجذب۔ وہ پسندیدۂ حسن ہے اور یہ حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سنا ہے کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی گردن جھکا کر جھانک نہیں لیتی۔"[۱]

"عورت ایک لذت ہے مجسم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادّی......"[۲]

زیادہ مثالیں طوالت کا باعث ہوں گی کیونکہ عورت اور اس کے حسن کا بیان جہاں بھی ہوا ہے ایک نئے پیرائے سے ہوا ہے۔ یہ امر نیاز کے ذوقِ جمال، یہ حسن پرستی اور اس کا والہانہ بیان ان کی تحریروں کو ایک حسن اور دلکشی بخشتا ہے۔

نظم ونثر دونوں میں رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے اکثر تشبیہات سے کام لیا جاتا ہے۔ نیاز اس فن میں بھی بہت مہارت رکھتے ہیں۔

"اس کے جوتے کی نوک ایسی سریع جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤں چوکڑی بھرتے وقت اور جب برقی رنگین روشنیاں اس کے قامتِ خوش اندام پر ڈالی جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے، جو راستہ بھول کر دنیا میں آگئی ہے یا سمندر کی دیوی ہے جو دنیا والوں کو ڈبو دینے سطحِ آب پر آگئی ہے۔"[۳]

"یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خدو خال کی کشمیریت، اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت......"[۴]

"اس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم اور جو بال ذرا الگ ہو گیا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار۔ اس کا جسم سفید تھا۔ جیسے چنبیلی اور اس کا نیچے کا حصہ جیسے چاندی اور موتی۔ ہاں اس کا یہ حصۂ جسم ایسا ہی تھا۔ اور سمندر کی سبز گھاس اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا......"[۵]

"اس کا نام کملا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح... اس کنول کی طرح جو سطحِ آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچیلی تھی۔ اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی۔ موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راج کماری گنگنانے لگی۔ اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی۔ جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے، سچے موتیوں کے باریک ذرے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں....."[۶]

"عریاں شانہ دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے آئینے میں دور کے کسی آبشارِ زریں کا نظارہ..."[۷]

---

[۱] ... [۲] ... [۳] نگارستان ص ... [۴] نگارستان ص ... [۵] جمالستان ص ... [۶] جمالستان ص ۱۴۵ - [۷] جمالستان ص ۲۰۲

اس کے ساتھ ساتھ نیاز رقص و سرود اور نغمہ و آہنگ کے بھی شیدا ہیں ۔ ان کی یہ فریفتگی اور ذوقِ نغمہ بھی انکی تحریروں پر اثر انداز ہوا ہے ۔ ان کی طبیعت میں مغنی کی لے اور رقاص کی لچک جاں گزیں ہے جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر ان کی عبارت میں بھی یہ نغمگی اور حرکت منتقل ہو جاتی ہے ۔ اسے عبارت کی خوبی سمجھا جاتا ہے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے کہا ہے کہ :۔ " ہر بہترین نثر کی علامت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت آواز میں مد و جزر اور دل آویزی پیدا ہو "[۱] ذرا غور سے دیکھیں تو ان کی عبارتوں میں یہ اثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں ۔ اس کی سب سے بڑی نشانی الفاظ کی تکرار ہے مثلاً :

" گھر گھر مجالسِ لطف و نشاط کا قیام گوشہ گوشہ میں رندانِ بادہ کوش کا اژدحام، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی اور ہر ہر گلی میں عشق کی تپش اندوزی، ہر شام کو شبِ عیش کے اسباب کی وہ افراط گویا صبح تک زندہ رہنا نہیں "[۲]

" پیالے پر جام بھر بھر کر دئے جانے لگے ۔ لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے ۔ اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں ۔ سر کٹ کٹ کر فرش پر گر رہے تھے "[۳]

" نہ بچے کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر مذہب کا خون آشام دیوتا بپھرا ہوا تھا ۔ اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا وہ خون کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس نہ بجھتی تھی ۔ معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جا رہے تھے ۔ اور ان کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر دیوتا خوش ہو رہا تھا ۔ حسین عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور ان کی چیخیں سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا "[۴]

" میری تکریم ۔ میری قدر ۔ میری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے ۔ وہ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے جو قبلۂ اہلِ دل ہے، جو زیارتگاہِ حسن ہے "[۵]

" اسکے جسم سے برقی شعاعیں نکل نکل کر میرے دل کے اندر تپ کی حرارت پیدا کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس کی رگ رگ میں آتشِ سیال دوڑ رہی تھی ۔ ۔ "[۶]

" یاد رکھو کہ یہ جنت کا لالچ دلا دلا کر رات رات بھر مریدوں سے پاؤں دبوانے والے دن دن بھر ملازموں کی طرح کام لینے والے مذہب کے دشمن ہیں "[۷]

" میری سر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ مریم پناہ "[۸]

" اللہ میاں کو توبہ توبہ تم نے خانہ زاد سمجھ لیا ہے ۔ جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے ۔ ۔ ۔ "[۹]

---

[۱] اردو اسالیب بیان صفحہ ۱۸ محی الدین قادری زور ۔ [۲] انتقادیات اول صفحہ ۲۲ ۔ [۳] حسن کی عیاریاں صفحہ ۱۵ ۔ [۴] حسن کی عیاریاں صفحہ ۱۵۹
[۵] ایضاً صفحہ ۲۲ ۔ [۶] جمالستان صفحہ ۲۱۶ ۔ [۷] مکتوبات حصہ اول صفحہ ۱۹ ۔ [۸] مکتوبات حصہ دوم صفحہ ۱۷۵ ۔
[۹] مکتوبات حصہ اول صفحہ ۹۰

"وہاں کالے کالے بادلوں میں سُرخ سُرخ ڈھیلا پھوٹتا ہے تو یہ "کاک ٹیل" دماغِ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے۔ مجھ پر اول اول جو اثر ہوا اگر میں بیان کروں بھی تو آپ کو اعتبار نہ آئے گا"[۱]

"بچہ بے قرار ہے، رو رہا ہے۔ ماں آغوش میں بھینچ بھینچ کے، سینہ سے لپٹا لپٹا کے، منہ چوم چوم کے اپنی ساری قوتِ محبت سے اسے چُپ کرا رہی ہے ۔۔۔۔"[۲]

اس کے بعد خاص طور پر عبارت کو دلکشی اور دل آویزی سے مزین کرنے والی چیز جا بجا حسین ولطیف اور بے تکلف شعروں کا استعمال ہے۔ یہ چیز بھی نیاز کی شاعرانہ طبیعت کا پرتو ہے۔ کوئی موضوع ہو حسبِ موقع اپنے مقصد کی وضاحت کے طور پر یا اپنے کسی قایم کردہ نظریہ کے ثبوت یا سند کے لئے یا کسی منظر وکیفیت پر روشنی ڈالنے کے لئے شعر کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اس بے تکلفی سے کہ لطف آجاتا ہے۔ اشعار کا یاد رکھنا واقعی قابلِ ستایش امر ہے اور اچھے اشعار کا انتخاب اور بھی زیادہ قابلِ تعریف بات ہے۔ لیکن بر موقع اور برمحل کسی شعر کا استعمال تو صلاحیت کا اظہار ہے اور یہ بات ہر آدمی کے بس کی نہیں۔ ویسے تو شاید ہی کوئی نثر نگار ایسا ہوگا۔ جو نثر لکھتے وقت شعر کے استعمال سے کُلّی طور پر اجتناب کرتا ہو۔ لیکن جس کثرت اور خوبی کے ساتھ ابوالکلام آزاد اور نیاز اشعار سے کام لیتے ہیں، وہ چیز عام نہیں۔ جہاں کہیں زیادہ کھُل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، وہاں اشعار کا استعمال اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کے خطوط میں اشعار کی بہتات ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر ٹھونسا گیا ہے۔ جو شعر جہاں آیا ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا آنا اشد ضروری تھا ورنہ شاید یہ بات نہ بنتی۔ یہ چیز بھی اُن کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے اور ان کے ذوق کی بلندی اس امر سے ظاہر ہے کہ گھٹیا درجہ کا یا پست مضامین کا حامل شعر شاید ہی کہیں مل سکے۔

"خط ملا۔ اس پر بھی نثار ہو جائیے اس "توسے نا ہیں بولوں رے" والی ادا کے قربان جائیے۔ نظام رام پوری کا شعر یاد آگیا۔

اے جان کہو پھر اس ادا سے میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جانِ عالم"، کے "جانِ نیاز" لکھ سکتا۔ ہائے غالبؔ ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مِرے لئے ہوتے"[۳]

"زندگی کے دوسرے سوانح کا ضبط و شمار کیسا — تاہم سن پیدائش و وفات کی جگہ آپ "ازل تا ابد" لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی جگہ صرف یہ شعر

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست خام بُدم پختہ شدم سوختم"[۴]

"کبھی کبھی اپنی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جایزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، گیا وہ واقعی صحیح و درست ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ"[۵]

"۔۔۔ سر یہ چند مہینوں کی بات ہے۔ اس کے لئے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک

---

۱ مکتوبات حصہ دوم صفحہ ۲۹۳ - ۲ نگارستان صفحہ ۸۲ - ۳ مکتوبات اول ص ۱۲۱ - ۴ مکتوبات اول ص ۲۲۳ - ۵ من ویزداں ص ۸۶

مذہبی انسان بھی ہو۔ اس لئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ:۔

روئے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ — آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند[۱]"

"سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کر کے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے لگی۔ جن کو ہر چند میں بھلا چکا تھا۔ لیکن ان کے بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتا۔

جاتی ہے کشمکش کہیں اندوہِ عشق کی — گو دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا[۲]"

ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ نیاز اس پر بھی قادر ہیں کہ پورے شعر کی بجائے مصرع ہی پر اکتفا کریں اور مصرع کو اس خوبی اور مہارت سے عبارت میں پیوست کریں کہ وہ نشتروں کا کام دے۔ مصرعوں کے استعمال کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اُردو نثر نگاروں میں نیاز کا مقام سب سے ممتاز ہے۔ تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ پڑھتے پڑھتے عبارت میں مصرعے آتے چلے جاتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ کہیں روانی میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً:۔

"ارے بھئی! ان کا کیا ہے۔ ع — وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

مشکل تو یہ بھاری ہے کہ ع — ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب ہمیں[۳]"

"لیکن جب اپنی فراست سے اسے سمجھا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ع ۔ خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند۔ آپ سمجھے یہ "درجات" کیا وہی درجاتِ بے نیازی وہی ع — نتواں ترا و جاں را بہم امتیاز کردن[۴]"

"اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہا تھا۔ گویا کسی نے یہ کہا:

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد[۵]"

"اگر جنت ایک زاہدِ شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ

فردوس را بدامِ نگہ می کنم شکار[۶]"

"میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے کہ

مستم چنانکہ گل نشناسم ز نوکِ خار ۔ وغیرہ[۷]"

"وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا نام ہے صرف "ہمیں جائے من و جائے تو باشد" کا[۸]"

یہ ذوقِ شعر ان کی طبیعت میں اتنا رچ گیا ہے۔ کہ حافظہ کی بے پایانی نے یہ اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ نیاز بے تکلفانہ نثر لکھتے جاتے ہیں اور ان میں شعر تو رہا ایک طرف مصرع بھی نہیں بلکہ ایک ایک دو دو الفاظ اس طرح کے پیوست کرتے جاتے ہیں کہ

---

[۱] تاثرات نیاز صفحہ ۱۰۔ [۲] مذاکراتِ نیاز صفحہ ۳۰۔ [۳] مکتوبات سوم صفحہ ۲۰۔ [۴] مکتوبات سوم صفحہ ۹۱۔ [۵] مذاکرات صفحہ ۳۳۔
[۶] من و یزداں صفحہ ۳۶۔ [۷] من و یزداں صفحہ ۳۸۔ [۸] شہاب کی سرگزشت صفحہ ۱۰۷

قاری کا ذہن خود بخود اشعار کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چیز کمال وضاحت پر دلالت کرتی ہے کہ ایک دو لفظ جو ٹکڑے ہوئے بھی ہوں بلکہ اگر کوئی نہ پہچانے تو یہ بھی نہ معلوم ہوسکے کہ ان کا پس منظر کیا ہے اور پس منظر کے نا معلوم ہونے کے باوجود بھی ان کی ذاتی قدر و قیمت میں فرق نہ آئے، اس طرح عبارت میں لائے جائیں کہ محض ان کے اشارے ہی سے وسیع مضامین خیال میں آجائیں اور عبارت بھی گراں بار نہ ہو۔

"جی ہاں کل میر صاحب تشریف لائے تھے اور جتنی "گالیاں" انھیں یاد تھیں، سب "صرفِ درباں" کر گئے۔ میں آپ کا "درباں" ہی ہوں نا"[1]

اس عبارت میں انھوں نے غالب کے شعر کو خوب کھپایا ہے۔

واں گیا بھی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب　　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

اس طرح غالب کے اس شعر کی طرف

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے　　　جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

اس عبارت میں کیسا اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے:۔ "اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے۔۔۔۔"[2]

اس طرح جب ہم ان کی یہ عبارت پڑھتے ہیں:۔

"آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک "رندِ شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے"[3]

تو ذہن فوراً اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے:۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا　　　اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

"حکم بر ستارہ کنم"، تو نہایت ضعیف سی بات ہے۔ یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے۔"[4]

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں،　　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

"۔۔۔۔ سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں شہادت کو زندہ وزنی قرار دے یا اس "خونِ بہا" کو"[5]

اس عبارت سے ذہن فوراً ان دو اشعار کی طرف جاتا ہے:۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　　اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی　　　(سودا)

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　　شہیدانِ نگاہ کا کیا خوں بہا کیا　　　(غالب)

"پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی رعنائیوں میں گرمیِ خرام پیدا کر رہی ہے اور ہوا کا جھونکا گویا "موجِ خرام" یار ہے۔ جو ہر جنبش پر گویا گل کتر کر گزر جاتا ہے۔"[6]

ظاہر ہے کہ خرامِ یار اور گل کترنے سے غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا،　　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ایک اور خصوصیت جو نیاز کی نثر میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض اوقات جذبات کی شدت کے وقت ان میں ایک خطیبانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی چھوٹی سی بات کو جو مختصر عبارت میں بھی بیان کی جاسکتی ہو خوب پھیلا دیتے ہیں۔ یہ چیز بھی مولانا

---

[1] مذاکرات اول ص ۶ - [2] مذاکرات نیاز ص ۱۲ - [3] مذاکرات نیاز ص ۱۰۸ - [4] مذاکرات نیاز ص ۱۰۸ - [5] جمالستان ص ۴،

ابوالکلام آزاد کی طرزِ نگارش سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا طبعًا خطیب ہیں، اس لئے ان کی عبارت میں اس چیز کی افراط ہے۔ اور خطیبانہ رنگ نیاز کے مذہبی مضامین میں دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک مثالیں جو نیاز کی مختلف کتب سے لی گئی ہیں ملاحظہ فرمائیے :-

"میں دیکھ سکتا ہوں کہ ایک شخص مجبور ہو کر اپنے وطن کی یاد اپنے دل سے بھُلا دے۔ اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتا کہ آزادی کی حالت میں ترکِ اُلفت کے بہانے تلاش کئے جائیں۔ میں اس بات کو سن سکتا ہوں کہ ایک شخص عام اضطراب میں ممنوعات اپنے اوپر جایز کر لے لیکن اس کے سننے کی تاب مجھ میں نہیں کہ صرف ہوا و ہوس کی مجبوری سے کسی لغو تاویل کو درست سمجھ لے۔ میں ایک ظالم و سخت گیر قوت کے سامنے سر جُھکا دینے والوں پر ملامت نہیں کرتا خواہ وہ قوت کتنی حدودِ دیں کیوں نہ ہو۔ لیکن میرے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ قوت سر جھکا دینے پر کسی کو مجبور نہیں کرتی اور یہ عجز، دنائتِ اخلاق کا نتیجہ ہے۔ میں کسی جدید تعلیم یافتہ کو مذاقِ سلیم سے معرّا دیکھ کر اس خیال سے خاموش رہ سکتا تھا کہ یہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن اظہارِ نفرت و ملامت اس وقت میرے اختیار سے باہر ہے، جب میں جان لوں کہ تعلیم جدید سلبِ وجدان نہیں کرتی۔ میں کسی کو مجنونِ فیشن و لباس دیکھ کر اس یقین کی بنا پر دم بخود رہ سکتا ہوں کہ شاید فنونِ یورپ صرف یہی سکھاتے ہوں گے۔ لیکن .... الخ"[1]

"جب ارتقاءِ انسانیت کی یہ حالت ہے۔ اور ... قابلیت کا یہ عالم، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جو ادبی روحانیت اور روحانی ادب سے اظہارِ نفرت و حقارت کو معیارِ قابلیت دے چکے ہیں، وہ لوگ جو ذوقِ شعر ہی سے اس لئے متنفر ہیں کہ یورپ ان کا مرشدِ مقدس اس طرف متوجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پاکیزہ ترین ادبی مذاق کو بھلا بیٹھے ہیں، اس بنا پر کہ ان کے پیرِ مغاں کا وہ مسلک نہیں، وہ لوگ جنھوں نے اپنے محاسنِ قومی و خصوصیاتِ مذہبی سے یکسر روگردانی اختیار کر لی، اس خیال سے کہ وہ ایک مدعیِ تہذیب قوم کے نزدیک افسانہ ہائے پارینہ ہیں وہ لوگ .... الخ"[2]

"یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ دنیا میں کسی چیز کا قایل بھی ہوں یا نہیں ...... اے حضرت آپ کا قایل ہوں۔ آپ کی پارسائی کا قایل ہوں۔ آپ کی شب زندہ داریوں کا قایل ہوں ...."[3]

"خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اُٹھی ہوں گی۔ سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہوگا۔ آج کل کے سینڈو اور گاما کا کیا ذکر وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں ...... الخ"

"آج سے میری تمام تحریریں ایک ایسے شخص کی تحریریں سمجھی جائیں۔ جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ...... لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا۔ اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے۔ اگر وہ بغیر

---

[1] مقدمہ گیتان جلی ص۲۰ ـ [2] ایضاً ص۱۰۹ ـ [3] مکتوبات سوم ص۲۷

اطمینانِ نفس پیدا کئے ہوئے ہے جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا۔ اگر وہ مجموعۂ مزخرفات و خرافات نہیں ہے اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں دست گیر و راہنما بن سکتا ہے۔ تو اے مسلمانو! میں پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں۔ ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحیدِ خداوندی کا اقرار کرنے والے کو کافر قرار دیں......"[1]

جہاں تک فقروں کی ساخت کا تعلق ہے۔ یہ بالعموم لمبے ہیں اور اس وصف میں وہ سرسید کے انداز سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ سرسید کی بھاری بھرکم شخصیت اور ان کے وسیع و عریض مقاصد، ان کی بے پایاں ذمہ داریاں ان کی طرزِ تحریر پر اسی صورت میں اثر انداز ہوئیں۔ یعنی عبارت میں بھی ایک بھاری بھرکم پن پیدا ہو گیا۔ سرسید کی عبارت میں اور، جس، لیکن اگر، مگر، پھر، کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ یہی چیز بڑی حد تک نیاز کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نیاز کی ذمہ داریاں سرسید کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، ان کی دنیا سرسید کی دنیا سے بہت وسیع ہے۔ نیاز نے بہت زیادہ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس چیز میں ان کی طبیعت کی جولانی کے علاوہ انکا اڈیٹر ہونا بھی کسی حد تک ممد ہے یعنی ایک تو طبیعت کی اس افتاد کے سبب کہ وہ جلد جلد اور تیز تیز اپنے مطالب کا بیان کرنا چاہتے تھے، ان کے فقرے لمبے ہو گئے۔ اور جو۔ جس وغیرہ کی قبیل کے الفاظ زیادہ استعمال میں آئے۔ دوسرے ایک رسالہ کے اڈیٹر ہونے کی وجہ سے بعض اوقات انھیں نصف یا اس سے بھی زاید پرچہ خود ہی لکھ کر پورا کرنا پڑتا تھا[2]۔ اس وجہ سے بھی انھیں بہت زیادہ اور بہت مختلف موضوعات پر قلم اٹھانا پڑا۔ جس کی وجہ سے جہاں مضامین وسیع ہوئے وہاں عبارت کے جوڑ بند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ نہیں کہ نیاز کے ہاں چھوٹے فقرے نہیں پائے جاتے۔ چھوٹے فقرے بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان کی عبارت رواں ہونے کے باوجود کسی حد تک پھیکی ہو جاتی۔ خطوط میں زیادہ حد تک چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرتے ہیں اور مذہبی بحثوں میں زیادہ تر طویل فقرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں موضوع زیادہ سنجیدہ ہو اور امور بحث طلب ہوں وہاں فقرے لمبے ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں محض شگفتگیٔ خاطر کے لئے لکھی جائیں ان میں فقرات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں[3]۔

یہ ان کے طرزِ تحریر کی چند مجموعی خصوصیات ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ ہر موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور مضمون کے لحاظ سے ایک جدا اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانہ اس میں بھی رومانی اور عام اخلاقی افسانہ۔ استدلالی مذہبی مضامین انشائے لطیف۔ عام علمی مضامین۔ تنقید اور خطوط وغیرہ موضوعات ایک دوسرے سے بُعدِ بعیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی مصنف کے مختلف موضوعات کی عبارتیں بالکل یکساں نہیں ہوتیں۔ مصنف کی طبیعت کا جزوِ اہم ان میں قدرِ مشترک کے طور پر ضرور موجود ہوتا ہے اور اس سے اس کا مصنف پہچانا جا سکتا ہے۔ خواہ موضوع کوئی کیوں نہ ہو لیکن مضامین کے اپنے اپنے لب و لہجہ کے تفاوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی عبارات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری۔ آبِ حیات۔ نیرنگِ خیال۔ بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ لیکن سیرِ ایران اور اُن کے خطوط کا اسلوب اِن سے مختلف ہے۔ سخندانِ فارس نہ ان کے خطوط کی طرح سادہ ہے نہ آبِ حیات کی طرح پرکار۔ قصصِ ہند اور درسی کتابیں جو مولانا نے دانستہ آسان عبارت میں لکھیں۔ ان کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہے لیکن ان تمام ظاہری فرق کے باوجود مولانا کی طبیعت کا خلوص اور دردمندی ہر جگہ کارفرما ہے اور آزاد کا شخصی رنگ ہر عبارت میں جھلکتا ہے۔ اس لئے یہ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ عبارت کا مصنف کون ہے۔ یہی حال مولانا شبلی کا ہے۔

---

[1] من و یزداں ص۱۴۳ - [2] ۱۹۳۰ء کے قریب کے رسائل ملاحظہ ہوں - [3]

انھوں نے سیاسی تاریخیں بھی لکھی اور علمی ادبی مضامین بھی لکھے اور خطوط بھی۔ لیکن شعر العجم میں جو دلکشی ہے، ظاہر ہے کہ وہ الغزالی میں نہیں ہو سکتی۔ اور جو دل آویزی ان کے خطوط میں ہے وہ مقالات میں نہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ خود انکے خطوط لطف اور چاشنی کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ جو عطیہ فیضی کو لکھے گئے اور باقی وہ جو "مکاتیبِ شبلی" میں شامل ہیں۔ تاہم شبلی اپنی ہر تحریر میں موجود ہیں۔ ان کی حسّاس طبیعت اور مزاج کی نزاکت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بعینہ یہی حال نیاز کی تحریروں کا ہے۔ ان کی کوئی تحریر اُٹھا کر دیکھ لی جائے۔ نیاز کی مضطرب طبیعت اس میں جلوہ گر ہوگی۔ ہر جگہ عبارت کی طراری اور زلزلہ انگیزی اپنے مصنف کی شخصیت کی آئینہ دار نظر آئے گی۔

بہرحال یہ درست ہے کہ نیاز کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت بہت زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں ٹیگور کا اثر ان پر زیادہ تھا۔ مضامین خیالی بھی بہ افراط تھے اور مجرد تشبیہات کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان کی وہ نثر بیدل کی شاعری سے مماثل کہی جاسکتی ہے، جو خوبی اور رعنائی کے باوجود لفظاً بھی اور معناً بھی مشکل تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں وہ دلکشی تھی کہ نوجوانوں نے ان کے اسلوب کی تقلید کرنا چاہی اور اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو بیدل کی شاعری کے مقلدین کا ہوا۔ یہ چیز عجیب غریب ہے کہ ایک شاعر اپنے مقلدین سے گھبرا کر اپنی روش میں مناسب ترمیم کرنے پر مجبور ہو جیسا کہ تاجور نجیب آبادی نے لکھا ہے[۱]۔ اس امر کے متعلق عزیز احمد نے اپنی مشہور تصنیف "ترقی پسند ادب" میں مواخذہ کیا ہے۔ وہ اُن کی اس رومانیت پسندی کو ادب برائے ادب کے مسلک سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اگر جدید اُردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے۔ تو وہ نیاز فتحپوری ہیں۔ اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو۔ "شاعر کا انجام" کا تمہید[۲]۔ اس تمہید کا ایک حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ "اے دلِ ویرانہ! اپنے نغمہ ہائے شکستہ تیرے ہی سازِ بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے۔ یہ عرضِ نغمہ تیری ہی ہستیِ متلاطم کے حضور میں خجلت کا دش نہ ثابت ہو" ظاہر ہے کہ یہ رنگ آخر تک قایم نہیں رہا نیاز خود اس طرف متوجہ ہوئے اور عبارت کو سہل بنانے کی کوشش کی بعض مقامات پر اندازِ بیان کو بدل دیا اور بعض مقامات پر بہ خیال خود غیر ضروری عبارت کو کاٹ دیا۔ مثلاً شہاب کی سرگزشت کے پہلے اڈیشن اور بعد کے اڈیشن میں اس قسم کا ردّ و بدل ملتا ہے مثلاً پہلے اڈیشن میں یہ فقرہ تھا "کیا مقصد کی کامیابی دُنیا میں نامطبوع چیز خیال کی جاتی تھی"[۳]۔ اب نئی کتاب میں ہے "کیا مقصد کی کامیابی دنیا میں بُری بات ہے"[۴] اسی طرح انھوں نے متعدد جگہ عبارت کو مختصر کرکے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ عبارت:۔

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو۔ اور یقین کرتے ہو کہ زمانہ اس صدمہ کو بھلا دے گا۔ مجھ سے معافی چاہ کر اس خلا کو پُر کر دوگے۔ جو مراسم محبت میں پیدا ہوگیا ہے ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ میں کمی پیدا کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم مجھ سے طالبِ عفو کرو۔ لیکن محمود یہ قطعی ناممکن ہے۔ کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو"[۵]۔

اب اس طرح ہے:۔

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ کو کم کر دے۔ لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو"[۶]۔

---

۱ روحِ انتخاب ص ۲۳۴ — ۲ ترقی پسند ادب ص ۱۶ — ۳ شہاب کی سرگزشت (پرانا اڈیشن)

۴ شہاب کی سرگزشت (نیا اڈیشن) ص ۱۲ — ۵ شہاب کی سرگزشت (پرانا اڈیشن) ص ۸۴-۸۵

۶ " " (جدید اڈیشن) ص ۷۹

"دنیا میں ایک خودغرض شخص سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنے حملہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ وہ اُس کے احباب ہوتے ہیں"[1]

اب یہ فقرہ اس طرح ہے:۔

"دنیا میں ایک شخص سب سے پہلے اپنے حملہ کا مستحق احباب ہی کو سمجھتا ہے"[2]

"البتہ القمر اپنی تمام بے حجابیوں اور بے باکیوں کے ساتھ: رُکنے والی جوانی کی طرح اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی آرہی تھی"[3]

اس کو اس طرح بدل دیتے ہیں:۔

"ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شرابِ زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی"[4]

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شروع کی تحریروں سے اب کی تحریریں کچھ مختلف ضرور ہیں۔ فقروں کی ساخت اور ان میں مشکل الفاظ کی کمی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عنفوانِ شباب کے جوش اور ادھیڑ عمر کے سکون سے عبارت میں کتنا فرق آجاتا ہے۔ شہاب کی سرگزشت کے نئے اڈیشن میں بعض جگہ فقرے کے فقرے جو اب شاید ان کو غیر شائستہ نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے کاٹ دئے ہیں۔

نیاز کی عبارت میں خامیاں بھی ہیں وہ بعض اوقات عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے ایک تو عبارت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے عبارت عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر شعوری طور پر کر جاتے ہوں کیونکہ عربی فارسی کا مطالعہ انھوں نے کافی کیا ہے۔ مگر اُردو کی سلاست میں اس سے ضرور فرق آجاتا ہے۔

"دُنیائے شاعری مشکل سے ایسے "ایجاز سدید" "بیانِ جزیل اور عبارت انیق" کی پاکیزہ مثال پیش کر سکتی ہے۔ مومن اسلوبِ ادا اور قدرتِ بیان کا بادشاہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کا اظہار کرتا ہے۔ تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔"[5]

اس قسم کی عبارتیں ان کی ہر کتاب میں مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "ایک شاعر کا انجام" کے چند فقرے نقل کرتے ہیں:۔ "میرے کوائف سے استبعاد حقیقی ہے"۔ "آج کم و بیش ۳۰ دن ہوئے جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا"۔ "اس کی آنکھیں یوں تو اور بھی مسترحم اور عاشقانہ کیف کا محلِ نظر آئیں"۔ میرے لئے وجہ نکوہش ہے"۔ "اس کی نگاہوں کی عادتِ مستمرہ ہو گی" وغیرہ

اسی طرح نگارستان میں بھی ہمیں اس قسم کے فقرے مل جاتے ہیں۔ "اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے استرحام پیدا کر سکتے"۔ "رسمِ مناکحت قاطبتہً مسدود"۔ "عقد انامل پر اسم الٰہی کا ورود شروع کر دیا"۔ نگارستان کے پُرانے اڈیشن سے بھی چند فقرے ملاحظہ ہوں:۔ "اس کے پاس ایک ساختۂ سحر گھوڑا تھا"

"جسارت مستمرہ اور سلاستِ مقالی عود کر آتی"

اور پھر "طیران" بجائے اُڑان کے استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات نیاز خود بھی اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے بعض الفاظ قاری کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے وہ کئی دفعہ توسین میں معنی بھی لکھ دیتے ہیں جیسے طیور جمیل

---

[1] شہاب کی سرگزشت (پرانا اڈیشن) ص ۴۸۔ [2] شہاب کی سرگزشت (نیا اڈیشن) ص ۸۰۔ [3] شہاب کی سرگزشت (دنیا اڈیشن) ص ۱۱۰۔ [4] مثلاً جدید اڈیشن ص ۱۷۶ اور پرانے اڈیشن کا ص ۱۸۷۔ [5] انتقادیات حصہ اول ص ۳۷۔

کے حویصلات (پپوٹوں) کو زمردِ گیاہ کے دانوں پر بھرنے سے مامور تھے۔"[۱]

مجموعی اعتبار سے نیاز کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان ایک جداگانہ شان کا مالک ہے، جس طرح ان کی شخصیت دوسرے مصنفین کی شخصیتوں سے مختلف ہے، اسی طرح اُن کا اسلوب دوسروں کے اسالیب سے جدا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو کسی اور مصنف کی تحریروں کے مماثل نہیں قرار دے سکتے۔ وہ مذہبی معاملات میں سرسید کی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن مذہبی مضامین پر قلم اُٹھاتے وقت سرسید کی سی سادگی اور استدلال کا کڑا پن برقرار نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی سی متانت اور سنجیدگی قایم نہیں رکھ سکتے۔ حالی کی سادگی سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نہ محمد حسین آزاد کی طرح ان کی عبارت میں تصویریت اور شدتِ احساس کا غلبہ ہے۔ مرزا غالب کی نثر سے بھی ان کی نثر کو کوئی مناسبتِ قریبہ نہیں۔ کیونکہ غالب کی شوخی اور بے تکلفی میں بھی ایک وضع داری موجود ہے۔ اگرچہ نیاز اپنے خطوط میں شوخی اور بے تکلفی سے پوری طرح کام لیتے ہیں۔ لیکن اس وضعداری اور برگزیدگی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ تاہم اپنی جگہ نیاز کی نثر کسی بھی دوسرے مصنف کی نثر سے کم رتبہ نہیں کہی جا سکتی اور نہ ان کو کسی کا مقلد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ "اسلوبِ نگارش ایک ذاتی جوہر ہے.... انسان کی ذہنی ساخت کا اثر اس کی عبارت پر پڑتا ہے۔ الفاظ کی دروبست اور اُن کا محل استعمال، شخصی تخیل، زبان پر قدرت اور لطیف جمالیاتی احساس یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کے اتباع سے حاصل نہیں ہوتیں۔ انشا پردازی کے اصول جان لینے سے کبھی بھی بڑا انشا پرداز پیدا نہیں ہوتا۔"[۲] نیاز کا طرزِ نگارش بڑا دلکش و دلفریب ہے۔ عبارت میں ایک حرکت ہے اور زندگی، یبوست، خشکی اور بے رونقی کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔ نئی نئی ترکیبیں، نیا نیا اسلوبِ بیان اور بدیع مطالب کے سبب جگہ جگہ گلہائے رنگا رنگ کی نمود نظر آتی ہے۔

ان کی تحریروں میں نشیب و فراز ہیں۔ مذہبی مضامین میں ایک کڑا پن بھی اور طعن و تشنیع کی۔ آویزی بھی۔ ماہرو ماعلیہ میں بے باکی بھی ہے اور سخت گیری بھی۔ خطوط میں شیرینی بھی ہے اور شوخی بھی۔ غرض مکمل یکسانی و یک رنگی نہیں ہے لیکن اس اختلافِ لب و لہجہ کی حیثیت وہی ہے جو مختلف رنگ پھولوں کی غالب کے نزدیک ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

یہ ساری چیزیں مل کر نیاز کے اسلوب کی تعمیر کرتی ہیں اور یہی رنگا رنگی اُن کے انداز کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

محمد خورشید عاصم

(ادبی دنیا) سے نگار میں نقل کرنے کی وجہ؟

Some Secrets of Style

۱ـ جمالستان صفحہ ۲۷۹ ـ ۲ـ

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسنِ بیان، ندرتِ خیال اور پاکیزگیٔ زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی اور معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ـ مینجر نگار

"واہ رے ہیں"

"گاہے گاہے باز خواں"

مذاہب کا مستقبل

آفتاب کا طلوع و غروب، روز و شب کا تسلسل اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی۔ لیکن حقیقتِ امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہلِ علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "عالم حادث ہے، متغیر ہے"۔

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے۔ غالباً نہیں۔ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقلِ انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جارہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ کس نقطہ پر پہونچ کر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لے کر آیا ہے جسے "حسِ اجتماعی" (جسے Herd instinct) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظامِ تمدن ہے جس کا آغاز "عہدِ حجری" سے ہوا اور اب "عہدِ برقی و شعاع" ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ وہ اس سے بھی بلند گزر کر "عرشِ کبریائی" تک نہ پہونچ جائے گا ــــ الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہنِ انسانی برابر ترقی کرتا جارہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پاسکتے ہیں ــــ جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جارہی ہے اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریے، آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و نامکمل نظر آتے ہیں، تو کیا اس کا اظہار اُن کی تنقیص ہے؟

نظامِ بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں، لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قایم ہے، نیوٹن کا نظریۂ کشش ممکن ہے "انیشٹین" کے نظریۂ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہو جائے لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زریں حروف میں نظر آسکے گا۔

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسۂ اجتماعی کے اقتضاء پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں، اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے اس کا مقصود نوعِ انسان کی خدمت اور تشکیلِ تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریاتِ زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقاید میں تغیر نہ پیدا ہو، لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً کسی پیمبر کی توہین نہیں، کیونکہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہو وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاءِ خیال کے لحاظ سے اصول مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:- "ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا"

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقاید مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں خصوصیت کے ساتھ مسلمان کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قایم ہوئی ہے کہ "خذ ما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کا ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے۔

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم "پیغمبرانہ روح" (Prophetic Soul) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (Priest mind) تھا یعنی ایک تو وہ نفوس پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور پھر ان میں اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیغمبرانہ روح کے حقیقی منشاء سے ناآشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے جن کے دماغوں نے ہادی اول کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی حقیقت کو دریافت کیا — یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی اور اب بھی جاری ہے فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی اس آزادی کو بزور شمشیر فنا کر کے اسے زیادہ اُبھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا اور آج یہ مجبوری اُٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قایم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے، اب آئیے اس جنگ پر ذرا وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں

اہلِ سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف اُنھی باتوں کے یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا اور اگر اہل مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلایل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے —— کیا یہ دلایل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کار آمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا لیکن جب دُنیا میں سیکڑوں مذاہب قایم ہوئے اور ہر ایک نے اپنے سوا تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگار حق کے لئے چارہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے، اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں کیونکر درست ہو سکتا ہو

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہونچ سکا جس سے آگے بڑھنے کی گنجایش باقی نہ رہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ دن جو گزرتا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اصول ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے —— اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آباد اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے صرف کا مطالبہ کرتا ہے۔

عقل انسانی نے عقاید مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی و جاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب و جبروت بادشاہ کی ہوتی ہے یعنی نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند۔ جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا ہے۔ اس کے بعد جب سترھویں صدی میں

ڈیکارٹ، کیپلر، گلیلو اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دُنیا کا کاروبار بے شک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص و متعین اصول و مقادیر پر۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون و اصول کی پابند ضرور ہے، جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارھویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم و نسق سے اُسے کوئی واسطہ نہیں — زمانۂ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے —

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا کچھ اور ہوگی یعنی مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بیدینی کا استیصال تیغ و خنجر سے کیا تھا بالکل اسی طرح بیدینی دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی۔ کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے وجدان پر قایم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپگنڈا سے زیادہ کچھ نہیں۔

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب جس میں ظاہری مراسم و شعائر کی پابندی ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا، مادی نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا، نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات علمی و تمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی و ما بعد الطبیعیاتی تسکین سو یہ علم اخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو تمام "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قایم کرنا چاہتی ہے — الغرض اس وقت مغرب کی علمی دُنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال چکا ہے چنانچہ ۱۹۲۷ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں صاف صاف کہدیا تھا کہ "کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی اسلامی حکومت ہے، ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین فرصت میں کالعدم ہونا چاہئے" — یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے، چین و ہندوستان میں بھی انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دُنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے، بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کون سی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دُکھ کا علاج اب تک نہیں کر سکا، اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہر حال اس دور انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصول کار میں اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے۔

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے۔ اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں۔ ان کا علاج سوا اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوا اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دور مغلیہ کا غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کر کے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قایدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا۔

تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ "اخوتِ عامہ" کا جذبہ ہے او...
خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقاید سے...
صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

اسوقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک بسیط مفہوم
اور اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلاء کا، عروج و ترقی کا، جدو جہد کا، کردو...
ایک ایسی "لامذہبیت" کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو...
پاکیزگیِ اخلاق اور تکمیلِ تمدن کی حامی ہے۔

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی
اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بناء پر تمام اسلامی ممالک میں
ظاہر ہو رہا ہے۔ جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قایم نہ رہے گی۔ اور اس
کا نتیجہ انعدامِ مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے۔

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آ...
جب ایک ایک شخص یہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ اسلام کی صورت آیندہ کچھ اور ہو لیکن اس کا مفہوم و...
جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اس کے خد و خال وہی ہوں گے جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے۔

کیا خوب

عقاید فی نفسہٖ اصل چیز نہیں بلکہ ذریعہ ہیں اصلاحِ اعمال و تربیتِ اخلاق کا جو اصل مقصود ہے مذہب کا۔ لیکن آج...
نام ہے صرف چند مخصوص حرکات کا، چند روایات کے مجموعہ کا، چند شعایر و عقاید پر جمے رہنے کا۔ اور اسی کا نام ہے مذہبی جمو...
اب اس دورِ حرکت و عمل میں کوئی جگہ نہیں اور اسے بہر نوع فنا ہونا ہے۔

(رعایتی قیمت)

تصانیف نیاز فتحپوری

(رعایتی قیمت)

من و یزداں کامل — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات

مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — ماله وما علیه — شہاب کی سرگزشت

فلاسفۂ قدیم — مقالات نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد

جذبات بھاشا — شاعر کا انجام

میزان ۵۵

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپئے میں اخیر جون ۵۳ء تک

مینجر نگار لکھنؤ

دعوتِ نقد و نظر

(۱) پروفیسر عطاء الرحمان (۲) عبدالصمد درد (۳) پروفیسر مرتاض حسین قریشی
(۴) فرمان فتحپوری (۵) انجم فوقی بدایونی

چشم طلب میں اور کوئی آشیاں ہے اب — میرے لئے قفس مجھے سارا جہاں ہے اب

دوسرا مصرعہ الجھا ہوا ہے۔ میرے لئے کے بعد مجھے بیکار ہے۔

چشم طلب کی جگہ میری نظر ہونا چاہئے۔ دوسرے مصرعہ میں میرے لئے کے بعد مجھے بیکار ہے۔

شاعر اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کر سکا اور ابہام پیدا ہو گیا۔

دوسرے مصرعہ میں مجھے حشو قبیح ہے۔ شعر میں معنوی و لفظی تعقیدیں دونوں موجود ہیں۔

مصرعۂ اول میں "اور کوئی" سے قدرت بیان کا ضعف ہوتا ہے، مصرعۂ ثانی میں "میرے لئے" "کے بعد" "مجھے" بیکار ہے۔

دل کی کیا تاب کہ پہونچے صفِ مژگاں کے قریب — جلوے خود لوٹ رہے ہیں رخ تاباں کے قریب

رخ تاباں کے قریب جلوہ کا لوٹنا عجیب سی بات ہے۔ ممکن ہے مژگاں کی برچھیوں نے جلوہ کو مجروح کر دیا ہو!

دل کوئی چلتی پھرتی چیز نہیں کہ صف مژگاں تک پہونچ سکے۔ جلوہ کا لوٹنا بھی مہمل سی بات ہے۔

دل کو صفِ مژگاں کے قریب جانے کی ضرورت ہی کیا ہے، جبکہ وہ دور ہی سے مجروح ہو جاتا ہے۔ جلوہ کا لوٹنا بھی عجیب ہے۔

جلوہ کے لوٹنے سے دل کی تاب کیوں مجروح ہو۔ اگر اس سے مراد جلوہ کی بیقراری ہے تو پھر تاب کی جگہ کوئی دوسرا لفظ "غرض یا ضرورت" کے مفہوم کا ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے صفِ مژگاں اور رخ تاباں کو دو بالکل جداگانہ چیزیں اس طرح قرار دینا کہ بعد مکانی کی طرف خیال منتقل ہو، حد درجہ غیر شاعرانہ بات ہے۔

مصرعے دو لخت ہیں۔

تاب دیدار رخ یار کہاں سے لاؤں — گر پڑی جا کے نظر گوشۂ داماں کے قریب

نظر کوئی گر پڑنے والی چیز نہیں۔

نظر کا گر پڑنا، بالکل مہمل سی بات ہے۔ نظر جھکتی ہے اٹھتی ہے، مگر گرتی نہیں۔

دوسرے مصرعہ سے پہلے مصرعہ کی تائید نہیں ہوتی

نظر کا گر پڑنا، مضحکہ خیز بات ہے اور گوشۂ داماں کی تخصیص کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

"تاب دیدار" کے بعد "رخ یار" کا اعادہ بیکار سی بات ہے، "تاب دیدار کہاں سے لاؤں" کا مفہوم یہی ہے کہ "رخ یار" دیکھنے کی تاب نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "گر پڑی جا کے نظر" غیر فصیح زبان ہے۔ اس کے علاوہ "گوشۂ داماں" نقاب کے معنوں میں بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔

دیکھئے میری تمناؤں کا احساس ہے — باغ فردوس میں تنہا نہ چلے جائیں آپ

(عطاؔ) :- یہ شعر بالکل مناجات کے رنگ کا ہے۔ معشوق خود فردوس بکنار ہے اسے فردوس کی کیا حاجت۔

(دردؔ) :- معلوم ہوتا ہے شاعر اپنے محبوب کو اسی لئے چاہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ فردوس میں جا سکے۔ سبحان اللہ

(قریشی) :- پہلا مصرعہ مبہم۔ تمنائیں کیسی؟

(فرمان) :- معلوم ہوتا ہے محبوب اور شاعر دونوں کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن محبوب کی مغفرت ہوگئی ہے اور شاعر ... وہ محبوب سے ملتجی ہے کہ مجھے لیکر جنت میں جانا۔ یوں نہیں عاشقی اور یہ فکر نجات! اللہ اللہ!!

(انجم فوقی) :- شعر کے مفہوم سے پتہ چلتا ہے کہ معشوق عالم نزع میں ہے اور یہ اپچ تغزل میں پہلی بار نظر سے گزری ... "باغ فردوس" تو فیصلۂ اعمال کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے۔

۵ - میری رگ رگ میں سما کر بھی یہ پردہ مجھ سے ظلم ہے ظلم جو آئینہ سے شرمائیں آپ

(عطاؔ) :- خود کو آئینہ تصور کرنا عاشقی کے لئے زیبا نہیں۔

(دردؔ) :- شرم و حیا تو محبوب کا فطری حسن ہے اور اسی سے عاشق گھبراتا ہے۔ علاوہ اس کے آئینہ کے ذکر کی بھی ... نہیں آتی۔

(قریشی) :- لفظ پردہ سے شاعر کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

(فرمان) :- نظروں اور دلوں میں سماتے سنا تھا لیکن رگ رگ میں سمانا نیا شعبدہ ہے۔ علاوہ اس کے رگ و ... بالکل مہمل بات ہے اور اگر آئینہ سے کچھ اور مراد ہے تو وہ شعر سے ظاہر نہیں۔

(انجم فوقی) "میری رگ رگ" کی جگہ "دیدہ و دل" کہنا چاہئے۔

۶ - بر سر لطف وہ شوخ ستم ایجاد ہے آج نالہ بھی نالہ ہے، فریاد بھی فریاد ہے آج

(عطاؔ) :- دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(دردؔ) :- پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔ "بر سر لطف و کرم وہ ستم ایجاد ہے آج"

(قریشی) :- شاعر نے نالہ و فریاد کو دو الگ الگ چیزیں سمجھ لیا ہے۔

(فرمان) :- "بر سر لطف" سے "آمادۂ لطف" کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرعہ میں الفاظ کی بے معنی تکرار ہے

(انجم فوقی) :- پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے :- "مایل لطف و کرم وہ ستم ایجاد ہے آج"

۷ - ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے شانِ قدرت دیکھ کر کھل گئیں آنکھیں طلسم حسن فطرت دیکھ کر

(عطاؔ) :- ردیف بیکار ہے۔

(دردؔ) :- اول مصرعہ کی ردیف بیکار ہے اور شعر دولخت ہے۔

(قریشی) :- پہلے مصرعہ میں دیکھ کر محض مطلع بنانے کے لئے لایا گیا ہے اور اس لئے بیکار ہے۔

(فرمان) :- "طلسم حسن فطرت دیکھ کر" کا ٹکڑا بالکل زاید ہے۔ اس کے بغیر۔ پوری ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے ش... اور حسن فطرت دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔

(انجم فوقی) :- لفظ "طلسم" محتاجِ ثبوت ہے، "ذرہ ذرہ" سے شانِ قدرت کا نمایاں ہونا حسن کا ... ہو سکتا ہے، میرے نزدیک یہ شعر اس طرح کہا جا سکتا تھا :-

ذرہ ذرہ سے نمایاں حسن فطرت دیکھکر میری آنکھیں کھل گئیں جلوؤں کی کثرت دیکھ کر

۸ - ہجوم غم یہ اندوہ مصیبت دیکھ کر اپنی حالت دیکھتا ہوں ان کی صورت دیکھ کر

:- ردیف بیکار ہے۔

:- یہ مطلع شروع سے آخر تک طفلانہ کاوش سے زیادہ نہیں۔ علاوہ اس کے "اندوہ و مصیبت" بھی عجیب ترکیب ہے۔

:- اندوہِ مصیبت کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ علاوہ اس کے اگر پہلے مصرعہ کو جوں کا توں رہنے دیا جائے تو پھر "اپنی حالت دیکھتا ہوں" کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

:- اندوہ و مصیبت کی ترکیب بے معنی ہے۔ "ان کی صورت دیکھ کر" کا ٹکڑا بھی زاید ہے۔

:- "اندوہ" خود ہی "مصیبت" کا دوسرا رخ ہے پھر "اندوہ مصیبت" کیا معنی؟ معنوی لحاظ سے بھی شعر مہمل ہے۔

۹ — عمر بھر کا ساتھ رنج و غم میں دے سکتا ہے کون — شمع بھی رخصت ہوئی میری مصیبت دیکھ کر

:- شمع کا رخصت ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

:- شمع غریب تو رات بھر کی مہمان ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ اس نے عمر بھر ساتھ نہ دیا، حیرت کی بات ہے۔

:- "عمر بھر کا ساتھ" غلط محاورہ ہے۔ لفظ "کا" نکالنا ضروری تھا۔

:- عمر بھر کی جگہ رات بھر کہا جاتا تو مناسب تھا۔ علاوہ اس کے "عمر بھر کا ساتھ" میں "کا" غیر ضروری ہے۔

:- پہلے مصرع میں "کا" زاید ہے۔

۱۰ — لالہ و گل کو دیکھتے کیا یہ بہار دیکھ کر — رہ گئے بیخودی میں ہم صورتِ یار دیکھ کر

:- "پہلے مصرعہ میں لفظ "کیا" صحیح مقام پر استعمال نہیں ہوا۔ دوسرے مصرعہ میں "رہ گئے بیخودی میں ہم" بھی کوئی مناسب فقرہ نہیں

:- پہلے مصرعہ میں یہ بہار کی جگہ اس کی بہار ہونا چاہئے اور دوسرے مصرعہ میں صورتِ یار کی جگہ جلوۂ یار

:- دوسرے مصرعہ سے شاعر کا عجزِ بیان ظاہر ہے۔ "رہ گئے بیخودی میں ہم" سے غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ ہم اتنے بیخود ہو گئے کہ لالہ و گل کو دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا۔

:- پہلے مصرعہ میں "کیا" فصاحت پر بار ہے۔ "بیخودی میں رہجانا" بھی غلط زبان ہے۔

(قریشی):- "رہ گئے بیخودی میں ہم" محاورہ و زبان دونوں کے خلاف ہے۔

۱۱ — وہ چمن میرا چمن ہے، وہ قفس میرا قفس — جس کے گوشہ گوشہ میں صدہا چمن، صدہا قفس

:- پہلے مصرعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ قفس بھی چمن ہی میں ہے، حالانکہ چمن میں آشیانہ ہوتا ہے قفس نہیں۔ چمن کے گوشہ گوشہ میں تو صدہا چمن کہا جا سکتے ہیں، لیکن قفس کے گوشہ گوشہ میں صدہا قفس کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(درد):- شاعر اپنے مفہوم کو واضح نہیں کر سکا۔

(قریشی):- دوسرے مصرعہ میں کوئی فعل آنا چاہئے تھا۔ بغیر اس کے مفہوم مستنبط نہیں ہوتا

(فرمان):- شاعر اپنا مافی الضمیر ظاہر نہیں کر سکا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں دوسرے گوشے کی "ی" وزن سے گرتی ہے۔

(... قی):- اچھی بات کہنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن دوسرے مصرع نے قدرے ابہام پیدا کر دیا۔

۱۲ — میں وہ خیر مقدم بلبل تھا دکھایا پھر نہ منھ — بوئے گل آ آ کے ڈھونڈھا کی قفس سے تا قفس

:- دوسرے مصرعہ میں "قفس سے تا قفس" بے معنی بات ہے۔

:- "قفس سے تا قفس" مہمل بات ہے۔

:- پہلا مصرعہ کوئی توجیہ شاعرانہ نہیں رکھتا اور "قفس سے تا قفس" کی ترکیب بھی بے معنی ہے۔

...رمان) :- "تفقس سے تاقفس" کیا؟ غالباً اس سے "ہر قفس" مراد ہے جو اس فقرہ سے واضح نہیں ہوتا۔

...م فوقی) :- "غیرتِ منہ بلبل تھا" کے بعد کافِ بیانیہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر دوسرا مصرعہ یقیناً اس طرح ہونا چاہئے تھا :-

بوئے گل نے بارہا ڈھونڈھا چمن سے تاقفس

۱۳- فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم
لپٹے پڑے ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم

...طا) :- "لذت سے ہم آغوش ہونا" اور بات ہے اور "لذت سے لپٹے پڑے ہونا" کہنا بالکل جداگانہ بات ہے اور نامناسب،

...رد) :- "لذت سے لپٹے پڑے رہنا" بڑی سخیف بات ہے۔

...شی) :- "لپٹے پڑے ہیں" — مناسب فقرہ نہیں۔

...ان) :- "لذت دردِ نہاں سے لپٹے پڑے رہنا" انتہائی رکیک بات ہے۔

...فوقی) :- مصرعۂ ثانی میں ذم کے باوجود مفہوم صاف نہ ادا ہوسکا۔

۱۴- بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر نپٹ کے سوگئے دردِ نہاں سے ہم

...طا) :- اس شعر میں بھی وہی خرابی ہے جو شعر نمبر (۱۳) میں ہے۔ علاوہ اس کے بے تابیوں کا دستِ ناز بن جانا بھی عجیب سی بات ہے۔

...رد) :- "بیتابیاں دستِ ناز ہوگئیں" یہ بھی عشق کا معجزہ تھا۔ کام دیا کی جگہ "کام کیا" لکھا جاتا تو بھی غنیمت تھا۔

...شی) :- اس میں بھی وہی لپٹ گئے والی بدتمیزی پائی جاتی ہے۔

...ان) :- اس شعر میں بھی وہی "لپٹ جانے" کی رکاکت موجود ہے۔ علاوہ اس کے دستِ ناز پر سر رکھ کر سوجانا تو خیر سمجھ میں آتا ہے لیکن "اس سے لپٹ کر سوجانا" کیا معنی رکھتا ہے۔

...فوقی : دوسرے مصرع میں "آخر" کی جگہ "یعنی" ہونا چاہئے۔

۱۵- اللہ رے حسن و عشق کی سحر آفرینیاں
خوش ہو رہے ہیں گھر کا گھروندا بنا کے ہم

...طا) :- گھر کا گھروندا بنانا محل نظر ہے، علاوہ اس کے اس میں سحر آفرینی کی کونسی بات ہے۔

...رد) :- گھر کا گھروندا بنانا، عجیب زبان ہے۔

...شی) :- گھر کو گھروندا بنانے سے غالباً مراد یہ ہے کہ حسن و عشق کی سحر آفرینیوں سے متاثر ہوکر آدمی گھر کو بھی گھروندا سمجھ کر بگاڑ بیٹھتا ہے۔ لیکن اس میں سحر آفرینی کی کونسی بات ہے۔

...ان) :- گھر کو گھروندا بنانے سے کیا مراد ہے؟ خدا جانے۔ سحر آفرینیوں سے حیرت ہوتی ہے نہ کہ خوشی۔

...فوقی) :- پہلے مصرعہ میں اگر جنونِ محبت کے قبیل سے کوئی لفظ لایا جاتا تو شعر بامعنی ہوجاتا

۱۶- کس کس پہ جان دیجئے کس کس کو چاہئے
گم ہوگئے ہیں بزمِ تمنا میں آکے ہم

...طا) :- شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم بزمِ تمنا میں آکر اس طرح گم ہوگئے کہ کسی کو چاہنے کا ہوش باقی نہ رہا۔ لیکن یہ کس کس کی تکرار کیا معنی!

...رد) :- بزمِ تمنا کی جگہ ہجومِ تمنا کہنے کا محل تھا۔

...شی :- مفہوم واضح نہیں۔

...رمان :- گم ہوجانے کا کوئی موقع نہیں۔ بزمِ تمنا سے ہجومِ تمنا کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا، معلوم ہوتا ہے معشوقوں کا بازار لگا ہوا ہے دوسرا مصرع یوں ہونا چاہئے :- "حیران سے ہیں بزمِ تمنا میں آکے ہم"

(انجم فوقی) :- اگر مصرعۂ ثانی میں "بزمِ تمنا" کی جگہ راہِ تمنا ہوتا تو لفظ "گم" کی رعایت زیادہ مضبوط ہو جاتی اور یہ نقص بھی نہ ہوتا کہ عاشق خود اپنی ہی تمناؤں پر کشمکش میں ہے - پہلے مصرعہ کے اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے دوسرا مصرعہ کچھ اس طرح کا ہونا تھا :-
کھوئے گئے ہیں بزمِ تمنا میں آ کے ہم

۱۷ - دم گھٹا جاتا ہے اے دستِ جنوں　　چاکِ دامانِ سحر دیکھوں میں [1]

(عطا) :- یہ شعر صحیح لکھا ہوا نہیں، اس لئے کوئی رائے نہیں دی جا سکتی

(وِرد) :- دوسرا مصرعہ پہلے سے بے تعلق ہے

(قریشی) :- شاعر کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ شبِ فرقت کی درازی سے دم گھٹا جا رہا ہے، اس لئے اے دستِ جنوں بڑھ کر شب کی سحر کا دامن چاک کر دے - لیکن اندازِ بیان ناقص ہے

(فرمان) :- یہ شعر اگر بے معنی نہیں تو چیستاں ضرور ہے

انجم فوقی :- "دستِ جنوں" اور "چاک دامانِ سحر" میں بعد المشرقین ہے "دم گھٹا جاتا ہے" نے شعر کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا - ممکن ہے کہ "دم گھٹنے" سے شاعر کا اشارہ بھیانک رات کی طرف ہو اور اسی مناسبت سے "چاکِ دامانِ سحر" لایا گیا ہے - بہر حال تاویل بھی فرمایئے، شعر اچھا خاصہ گورکھ دھندا ہے -

۱۸ - اس کوچہ میں ہوں صورتِ یک نقشِ وفا میں　　دنیا نے مٹایا مجھے لیکن نہ مٹا میں

(عطا) :- پہلے مصرعہ میں یک، حشو ہے - دوسرے مصرعہ میں مٹانا چاہا کی جگہ مٹایا لکھا گیا ہے -

(وِرد) :- یک حشو ہے -

(قریشی) :- مٹانا چاہا کی جگہ مٹایا کا استعمال کیا گیا ہے، جو صحیح نہیں -

(فرمان) :- "صورتِ یک نقشِ وفا" کی ترکیب ذوق پر بار ہے -

(انجم فوقی) :- اگر شعر کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ میں "اس کوچہ میں صورتِ نقشِ وفا موجود ہوں" جہاں دنیا نے مٹایا لیکن میں نہ مٹا - تو شعر کی معنوی حیثیت تو مکمل ہو جاتی ہے لیکن "صورتِ یک نقشِ وفا" اور "کوچہ" غور طلب ہے "نقشِ وفا" کا محل دل ہو سکتا ہے اور کوچہ کی رعایت سے بصورتِ نشانِ سجدہ' لیکن بات اس طرح کہی گئی کہ دونوں مفہوموں میں سے ایک بھی صحیح طور پر ادا نہ ہو سکا -

۱۹ - سراپا آرزو ہوں درد ہوں داغِ تمنا ہوں　　مجھے دنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں

(عطا) :- سراپا آرزو ہو کر داغِ تمنا ہونا متضاد ہے -

(وِرد) :- اجتماعِ ضدین ہے -

(قریشی) :- دوسرے مصرعہ میں روانی نہیں -

(فرمان) :- یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آرزو - داغِ تمنا اور درد ہی دنیا مشتمل ہے -

انجم فوقی :- مصرعۂ اولیٰ ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کسی کا آرزو مند ہے بلکہ ایک ناکامِ آرزو، مگر دوسرا مصرعہ بالکل یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ سراپا نیاز نہیں - بلکہ کلیتہً بے نیاز ہے، اسی تضادِ بیان نے شعر کو ناقص بنا دیا -

۲۰ - کبھی میں حسن کا عالم کبھی میں عشق کی دنیا　　نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں

(عطا) :- ردیف بہ واوِ معروف اچھی نہیں معلوم ہوتی

(وِرد) :- ردیف نامناسب ہے -

---

[1] یہ شعر شعلۂ طور میں اسی طرح درج ہے (نگار)

...) :- خیال کا پہلا حصہ اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا۔ دوسرا حصہ بھی ناقص انداز بیان ہے۔ "سو بار پیدا ہوں" کا ٹکڑا بھی اچھا نہیں

...) :- "اگر سو بار پیدا ہوں" کی تخصیص بے معنی ہے۔

...قی) :- اگر مصرعۂ ثانی کا انداز بیان ایسا ہوتا کہ سو بار بھی پیدا کیا جاؤں تب بھی خود ہی پر قربان ہونگا تو شعر نقص سے پاک ہو جاتا

- دستِ جنونِ شوق کی گلکاریاں نہ پوچھ — ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

...) :- دستِ جنون کی گلکاری اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے جسم کو ناخن سے لہولہان کر دیا ہے اور یہ منظر کس قدر عجیب ہے۔

...) :- محاورہ "سر سے پاؤں" تک ہے۔ "سر سے قدم تک نہیں۔

...) :- سر سے قدم تک ڈوبا ہوا ہوں! غلط انداز بیان ہے۔

...) :- بہار میں ڈوبنا محل نظر ہے۔ محض گلکاریوں کو بہار میں ڈوبنے کا سبب سمجھنا درست نہیں۔

...قی) :- "ڈوبا ہوا ہوں" محل نظر ہے اس کے علاوہ "سر سے قدم تک" محاورہ نہیں۔ "سر سے پاؤں" تک محاورہ ہے۔

- رگ رگ میں دل ہے دل میں تڑپ دردِ عشق کی — محشر بنا ہوا ہوں تمنائے یار میں

...) :- اس شعر میں بظاہر کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

...) :- محشر کا استعمال بے محل ہے۔

...) :- رگ میں دل۔ دل میں تڑپ محشر کے لوازم نہیں۔ پھر اپنے آپ کو محشر کہنا بھی عجیب بات ہے

...فوقی) :- "رگ رگ میں دل ہے" نہایت لغو ادعا ہے۔

- ۲۲ چھوڑا نہ تپِ عشق نے کچھ بھی کسی گھر میں — دل سے جو لگی آگ بجھی جا کے جگر میں

...) :- آگ کا جگر میں جا کر بجھ جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ جگر بھی جل گیا اس لئے یہ کہنا کہ تپِ عشق نے کسی گھر میں کچھ نہ چھوڑا درست نہیں۔

...) :- آگ جب جگر تک پہونچکر بجھ گئی تو جگر کیسے جلا۔

...) :- کسی گھر کی جگہ مرے گھر میں ہونا چاہئے۔

...) :- شاعری کی زبان میں دل و جگر ایک ہی چیز ہیں اس لئے کسی گھر میں کہنا درست نہیں

...فوقی) :- "جگر" محض قافیہ پیمائی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جگر میں جا کر آگ بجھنے کا سبب بھی ظاہر نہیں کیا پھر یہ کہ "دل سے لگ کر جگر میں بجھنا" ظاہر کرتا ہے کہ جگر سلامت رہ گیا، اس لئے کسی "گھر میں کچھ نہ چھوڑا" خوامخواہ کی بات ہے۔

- اب شمع بھی بجھتی ہے مرا دم بھی لبوں پر — کیا دیر ہے یارب شبِ فرقت کی سحر میں

...) :- "مرا دم بھی لبوں پر" یہ ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے تناسب نہیں رکھتا۔ اس طرح کہنا چاہئے تھا:-

بجھتی ہے اِدھر شمع بھی، دم بھی ہے لبوں پر

...) :- پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کے بعد ہے ہونا چاہئے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے:-

اب شمع بھی بجھنے کو ہے دم بھی ہے لبوں پر

...) :- دوسرے ٹکڑے کے بعد ہے لانا ضروری تھا۔

...) :- دوسرے ٹکڑے میں کسی فعل کا ہونا ضروری ہے۔

...فوقی) :- مصرعۂ اول ناقص طرزِ بیان ہے۔

- ۲ کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے — اور کچھ یہ ہے کہ مصلحتِ یار بھی نہیں

(عطا) :- دونوں مصرعوں کی ترکیب و ترتیب یکساں نہیں۔ پہلے مصرعہ میں "کچھ یہ" دوسرے میں "کچھ یہ ہے" تناسب نہیں رکھتے
دوسری بات یہ کہ مصلحتِ یار بھی محلِ نظر ہے۔

(درد) :- مصلحتِ یار کا ٹکڑا صحیح نہیں۔

(قریشی) :- کچھ یہ اور کچھ یہ ہے کے ٹکڑے عجزِ بیان کی دلیل ہیں۔

(فرمان) :- مجھے کا استعمال "مجھ میں" کے معنی میں درست نہیں۔ مجھے اسم مفعول کے طور پر مجھ کو کی جگہ بولا جاتا ہے اور یہاں اس کا محل نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں ہے کا استعمال بھی فصاحت کے منافی ہے۔

(انجم فوقی) :- "مصلحتِ یار" کا یہ تقاضا کہ تم "عرضِ شوق نہ کرو" شعر سے واضح نہیں ہوتا۔

۲۶- وہ دل کہ جس پہ حرفِ تمنا بھی بار تھا　　اب صرفِ شکوہ سنجیِ اغیار بھی نہیں

(عطا) :- کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ نہ کوئی شاعرانہ توجیہ ہے۔

(درد) :- مصرعے دولخت ہیں۔

(قریشی) :- دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔ شعر مہمل ہے۔

(فرمان) :- مصرعوں میں معنوی رابطہ مفقود ہے۔ "حرفِ تمنا کا بار ہونا" بھی محلِ نظر ہے

(انجم فوقی) :- عشق حاصلِ تمنا بھی ہے، بے نیازِ آرزو بھی لیکن دونوں باتیں ثبوت طلب ہیں، اس شعر میں:
"اب صرفِ شکوہ سنجیِ اغیار بھی نہیں" کی بھی معقول وجہ نہیں بتائی گئی۔

۲۷- خوفِ صیاد سے عالم ہے یہ بیتابی کا　　کہ ابھی ہوں تو ابھی صحنِ گلستاں میں نہیں

(عطا) :- بیتابی کی وجہ سے وجود عدم میں کس طرح تبدیل ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ خوفِ صیاد سے چمن سے بھاگ جائیں

(درد) :- دوسرا مصرعہ بہت عجیب ہے۔

(قریشی) :- خوف سے بیتابی پیدا نہیں ہوتی۔ پریشانی ہونا چاہئے۔

(فرمان) :- صیاد کے خوف سے بیتابی کا پہلو کیونکر نکلتا ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو "کبھی صحنِ گلستاں میں ہونا اور کبھی نہ ہونا" کیا معنی۔

(انجم فوقی) :- دوسرا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے۔

۲۸- ڈوب کر دل میں وہ نظریں تیر و پیکاں ہو گئیں　　رہ گئیں جو دل کے باہر نشترِ جاں ہو گئیں

(عطا) :- جو نظریں دل سے باہر رہیں وہ نشترِ جاں کیسے ہو گئیں۔ تعجب ہے۔

(درد) :- یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا۔

(قریشی) :- دل کے باہر رہ جانے والی نظریں "نشترِ جاں" کیسے ہو سکتی ہیں۔

(فرمان) :- نظروں کا چُبھ جانا بولتے ہیں۔ دل میں ڈوب جانا بلا کسی قرینہ کے درست نہیں۔ علاوہ اس کے یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ جو نظریں باہر رہ گئیں وہ نشترِ جاں ہو گئیں۔ اگر نظروں کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا تو پھر "کچھ نظریں" لانا ضروری تھا۔

(انجم فوقی) :- نظروں کا دل میں اتر جانا یا دل کے پار ہو جانا تو مستعمل ہے لیکن "دل میں ڈوب جانا" یا دل کی مناسبت سے نظروں کا "تیر و پیکاں" ہو جانا عجیب بات ہے، اس کے علاوہ جب نظریں دل میں ڈوب چکیں تو پھر دل کے باہر رہنے والی نظریں کونسی تھیں؟ جو "نشترِ جاں" ہو گئیں؟

(باقی)

تنوعات

گزشتہ سو سال کے اندر چھ لڑائیوں کا ایک دوسرے سے ریاضی کا عجیب وغریب تعلق پایا جاتا ہے یعنی ہر پچھلی لڑائی کے ختم سال میں اس کے ہندسوں کو علٰحدہ علٰحدہ جمع کر دیجئے تو آیندہ لڑائی کے آغاز کا سال نکل آتا ہے ——— چین کی لڑائی ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک جاری رہی۔ اب ۱۸۴۲ میں ۲، ۴، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۱۵) کو جوڑ دیجئے تو ۱۸۵۷ء ہو جائے گا جب ہندوستان میں غدر ہوا ——— اب پھر دیکھئے کہ غدر ختم ہوا ۱۸۵۸ء میں۔ اس میں ۸، ۵، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۲۲) کو ۱۸۵۸ء میں جمع کیجئے تو ۱۸۸۰ ہو جائے گا اور یہی سال مصر کی لڑائی کا تھا ——— مصر کی لڑائی ۱۸۸۱ء میں ختم ہوئی اس میں ۱، ۸، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۱۸) کو جمع کیجئے تو ۱۸۹۹ ہو گیا اور یہی سال جنوبی افریقہ کی لڑائی کا تھا۔ ۱۶۴۲ء سے انگریزوں کی سول وار شروع ہوئی۔ بادشاہ قتل ہوا اور پہلی جمہوریت کرامول کی سیادت میں قایم ہوئی ۱۶۴۸ء میں یورپ انقلابی سرگرمیوں کا شکار رہا اور زبردست قحط پڑا۔

اظہار محبت کے خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط وہ ہے جو اس وقت برطانیہ کے عجائب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ خط ملکۂ الزبتھ کے ایک درباری نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط چار سو باریک لکھے ہوئے صفحات کو محیط ہے اور موجودہ سایز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے ——— غالباً اس کی شادی اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی ورنہ غالباً وہ اسے باتوں ہی باتوں میں مار ڈالتا۔

امریکہ کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک مرتبہ کسی ملک کا سفیر اس کے کمرہ میں ناگہاں داخل ہو گیا جہاں لنکن اپنا جوتا صاف کر رہا تھا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں"

لنکن نے جواب دیا "ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کیا کرتے ہیں؟"

ایک سائنس داں نے نظریہ پیش کیا ہے کہ گوشت کا استعمال گلے کے اعصاب اور رگوں کی نرمی کو ضایع کر دیتا ہے اس لئے گوشت کھانے والے اچھے گانے والے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش کرتا ہے جو بہت گوشت کھانے اور بہت خراب گانے والے ہیں برخلاف اٹلی والوں کے جو گوشت بہت کم کھاتے ہیں اور عمدہ گانے والے ہیں۔

اس نے ثبوت میں اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ گانے والی چڑیاں جتنی ہیں سب گھاس پات کھاتی ہیں، برخلاف اس کے چیل، گدھ وغیرہ گوشت خوار طیور سب اس نعمت سے محروم ہیں۔

لڑکوں کی پیدایش جنگ کے وقت زیادہ ہوتی ہے یا اس کے بعد۔ پروفیسر مارسل تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ جنگ ختم ہونے کے بعد لڑکوں کی پیدایش زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی لڑائی کے بعد جب ۱۸۹۰ء میں

بیس سال کے نوجوانوں کی بھرتی شروع ہوئی ہے، تو ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتخاب مشکل ہوگیا۔ اس کا سبب پروفیسر مذکور نے یہ بتایا ہے کہ مردوں کی زیادتی انحطاط کی علامت ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہترین قوا کے مرد لڑائی کے میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور صرف بیمار و کمزور آدمی رہ جاتے ہیں، جن سے بہ حالتِ امن مشکل سے عورتیں شادی کرنے پر راضی ہوسکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انھیں مجبوراً انھیں چھٹے ہوئے مردوں سے عقد کرنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ پیدا ہوجاتے ہیں جو مردوں کے انحطاط کی علامت ہے۔

الاباما میں عورتیں پاؤں میں کوئی زیور استعمال نہیں کرسکتیں

اُتاہ میں جوتے کی ایڑی کی اونچائی ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

بوسٹن میں ہر کتے کی ٹانگ دس انچ سے کم ہونا چاہئے۔

مسیسپی میں بغیر جوتوں کا فیتہ باندھے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

نیویارک اسٹیٹ میں کوئی شخص گھوڑے کے پاس چھتری نہیں کھول سکتا۔

امریکہ کے کسی اخبار نے ایک ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کی لوگوں کو دعوت دی اور سب سے بہتر کہانی پر انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں نے حصہ لیا اور انعام ذیل کی کہانی کو ملا:۔

الونیا کو اپنے بھائی کا ایک تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ افریقہ کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے:۔ باپ شیر کا شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا۔ الونیا بہت رنجیدہ ہوئی اور فوراً تار دیا کہ "اسکی لاش گھر بھیجدو"۔ تین ہفتہ کے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہونچا، جس کے اندر شیر تھا۔ الونیا نے پھر تار دیا کہ:۔ "شیر پہونچ گیا، تم سے غلطی ہوئی، باپ کی لاش بھیجو"۔ اس کا جواب آیا کہ:۔ "غلطی نہیں ہوئی، باپ، شیر کے اندر ہے"

اٹلی میں باہر سونا لیجانے کی ممانعت ہے۔ خفیہ فروشوں نے یہ ترکیب کی کہ سونے کی کھونٹیاں اس قسم کی طیار کرائیں جیسی ریل کے فرسٹ کلاس ڈبوں میں لگائی جاتی ہیں اور ان پر نکل کی پالش کرادی۔ ریل میں بیٹھنے کے بعد اس کی کھونٹیوں کو علٰحدہ کرلیا اور یہ کھونٹیاں لگادیں۔ مقصود یہ تھا کہ جب اٹلی کی سرحد سے نکل جائیں تو سونے کی کھونٹیاں نکال لیں اور اصلی کھونٹیاں لگادیں۔

گٹھیا اور اسی قسم کے امراض کا علاج شہد کی مکھیوں کے ڈنک سے عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا۔

اگر انسان کے جسم سے تمام نمک نکال لیا جائے تو ۴۸ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمین کا سب سے زیادہ گہرا سوراخ وہ ہے جو کیلیفورنیا میں پایا جاتا ہے، یہ پٹرول کا کنواں ہے جو ۱۵۰۰۴ فٹ گہرا ہے۔

نبضِ دوراں

(فضا ابن فیضی)

میں نے صندل سی جبینوں کو بھی دیکھا ہے ملول
میں نے دیکھی ہے حسیں زلفوں پہ افلاس کی دھول

میں نے کمھلائے ہوئے دیکھے ہیں عارض کے گلاب
نظر آئے ہیں مجھے زرد، یتیموں کے شباب

میں نے دیکھی ہے ضمیروں میں گناہوں کی خراش،
بے کفن مجھ کو نظر آئی ہے انسان کی لاش،

میں نے تہذیب و قیادت کا فسوں دیکھا ہے
میں نے پیمانوں میں اقوام کا خوں دیکھا ہے

میں نے دیکھا ہے کلیساؤں کو فتنہ بنتے
قطرۂ آب کو دیکھا ہے تلاطم بنتے،

میں نے دیکھا ہے حقیقت کو سرابوں میں اسیر،
ہیں مرے سامنے بے پردہ مذاہب کے ضمیر،

میری نظروں میں بہاریں ہیں خزاں سے بھی ذلیل
میں نے دیکھا ہے گُلِ لالہ کی فطرت کو علیل

میں نے چہروں پہ یہاں موت کے غازے دیکھے
شاہ فاروق کی دولت کے جنازے دیکھے،

میں نے ایران میں دیکھا ہے مصدق کا مآل
میں نے ہر بدر کو بنتے ہوئے دیکھا ہے ہلال

میں نے دیکھے ہیں ہر اک قصر میں سونے کے صنم
زہر آگیں نظر آئے ہیں مجھے ساغرِ جم

میں نے دیکھے ہیں چھپے کتنے لباسوں میں جذام
مجھ کو شہروں میں نظر آئے ہیں خوشپوش غلام

خونِ نادار کو بنتے ہوئے دیکھا ہے شراب
میں نے ناسوروں پہ دیکھے ہیں امارت کے نقاب

عدل کے روپ میں بیداد کے بت دیکھے ہیں
میں نے یہ کھیل تمدن کے بہت دیکھے ہیں

کلام ساحر بھوپالی

میں ناداں نہیں ہوں کہ گھبرا کے غم سے
ترے پاس آکر تجھے دور کر دوں،

میں اس دم جوش میں اپنا گریباں چاک کرتا ہوں
کہ جب ہاتھوں میں آکر اُن کا دامن چھوٹ جاتا ہے

نگاہِ مستِ ساقی کا یہ اک ادنےٰ کرشمہ ہے
نظر ملتے ہی بس ہاتھوں سے ساغر چھوٹ جاتا ہے

لرز جاتے ہیں اُس دم یہ زمین و آسماں ساحر
کسی بے کس کے دل کا آسرا جب ٹوٹ جاتا ہے

وہ میرے صبر کا کب تک مقابلہ کرتے
کرم وہ مجھ پہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے

بیانِ ساحرِ برباد پہلے سن لیتے،
پھر آپ چاہتے جو کچھ بھی فیصلہ کرتے

بڑی مشکل سے دلِ زار ابھی بہلا سکتا،
ہائے کس وقت وفائیں تری یاد آئی ہیں

پناہ مانگتے ہیں وحشتوں سے ویرانے
تو ہی بتا کہ کہاں جائیں تیرے دیوانے

بھلا یہ کیف کہاں ہے سرورِ صہبا میں
تری نگاہ پہ صدقے ہزار میخانے

دُنیا والوں کی حقارت کی نہیں پروا مجھے
تم نہ نظروں سے کہیں اپنی گرا دینا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے ساحر وہ میرے ہو گئے
دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی دُنیا مجھے

وفورِ درد میں بھی مسکرا دیتا ہوں، پرسش پر
کیا ہے قصۂ غم کو اب اتنا مختصر میں نے

یہ عید!

(ساقی جاوید - بی - اے)

یہ عید کیف وطرب کا سرود گاتی ہوئی،
یہ موتیوں سے یہ ہیروں سے کھیلتی ہوئی عید
نکھارتی ہوئی محلوں کو خانقاہوں... کو
یہ نکہتوں کی ضیاؤں کے ساتھ چلتی ہوئی
یہ مسکراتی ہوئی بیکسوں، یتیموں پر
بساطِ وقت پہ رکھ کر مسرتوں کے ایاغ
یہ عید جس سے دعاؤں میں آگ لگتی ہے
مسل رہی ہے جو کلیاں جلا رہی ہے جو پھول
رخِ حیات پہ بن کر جو بھوک پیاس کا داغ

یہ قصرہائے امارت کو جگمگاتی ہوئی
تجلیوں کا یہ بادہ انڈیلتی ہوئی... عید
نشانِ قدس بناتی ہوئی کلاہوں کو
یہ زرنگار قباؤں کے ساتھ چلتی ہوئی
یہ بجلیاں سی گراتی ہوئی حریموں پر
یہ غمکدوں میں جلاتی ہے آنسوؤں کے چراغ
دکھے دلوں کی صداؤں میں آگ لگتی ہے
اڑا رہی ہے جو فاقوں کی صبح و شام پہ دھول
جبینِ لات و ہبل کے جلا رہی ہے چراغ

یہ بن چکی ہے زمانے میں مکر و فن کی اساس
خوشی کے نام سے ٹوٹی ہے اک رسول کی آس

رُباعیات رضوی

کچھ دن ہوسِ طرفہ ادا سے کھیلے
کچھ روز محبت اور وفا سے کھیلے
اب کھیل سے جی اوب گیا ہے رضوی
باقی ہے خدا - کون خدا سے کھیلے

فطرت کے مطالعہ سے تھرا اُٹھا
دل ایسے مشاہدوں سے گھبرا اُٹھا
معبودِ فریب آرزو کے بندے
کیا ہوگا عقاید کا جو پردا اُٹھا

ناساز اگر ہے تو دوا سے باز آ
بے روح اگر ہے تو دعا سے باز آ
وجدان پہ مت لاد روایات کا بوجھ
گر شک ہے خدا میں تو خدا سے باز آ

نگار کے پچھلے فایل

جولائی تا دسمبر ۴۳ء　=　پانچ روپئے
مکمل فایل ۵۳ء (مع نظیر نمبر)　=　پندرہ روپئے
مکمل فایل ۵۱ء (مع تنقید نمبر)　=　پندرہ روپئے

مینیجر نگار

لام انجم فوقی بدایونی :

طلب کی راہ میں ایسا بھی اک ہنگام آتا ہے — جہاں رہبر نہیں اے دوست، رہزن کام آتا ہے
بہ ذکرِ جور پہلے آپ ہی کا نام آتا ہے — پھر اس کے بعد دنیا پر بھی کچھ الزام آتا ہے
جہانِ رنگ و بو میں پھول بھی ملتے ہیں کانٹے بھی — سوال اس بات کا ہے کون کس کے کام آتا ہے
سکونِ عارضی، انعامِ فطرت ہی سہی لیکن — یہیں سے جرأتِ پرواز پر الزام آتا ہے

تم نے پھولوں کو نوازا، میں نے کانٹوں کو چُنا — غالباً دونوں ہی تھے ناآشنا انجام سے

تباہ کس نے کیا، اہلِ غم پہ کیا گزری؟ — جو سن سکو تو سنائیں کہ "ہم پہ کیا گزری"
کسی کی انجمنِ ناز تک چلے تو گئے! — پھر اس کے بعد نہ پوچھو کہ ہم پہ کیا گزری؟

ان سے کہہ دو کہ اب اُلٹ دیں نقاب — آئینہ کون دے زمانے کو؟
آپ کیوں اس ادا سے ہوں بدنام — غیر کیا کم ہیں مسکرانے کو؟

دل کو توڑا ہے تو سازِ زندگی بھی پھونک دو — ہو سکے تو اتنی زحمت اور بھی میرے لئے

لیجئے صبح ہوئی، چاند ستارے ڈوبے — آگیا وقت مرے جی سے گزر جانے کا

جلوۂ حسن سے روشن نہ ہوئی بزمِ حیات — اس لئے خون جلایا گیا پروانے کا

چھلکا تھا میرے واسطے پیمانۂ جمال، — تھوڑا سا کیف چاند ستارے بھی پا گئے

بھولنے کا قصد کرتا ہوں تو یاد آتے ہیں آپ — یوں بھی اکثر التفاتِ خاص فرماتے ہیں آپ

یہ کون سا مقامِ طلب ہے کہ تم بغیر — پہلے تو کچھ ملال تھا، اب کوئی غم نہیں

وہ میرے واسطے آنسو بہائیں — کہیں سچ مچ یہ دن بھی آ نہ جائیں
دلوں کو اذنِ بیتابی ملا ہے،، — یہ شیشے کیا عجب ہے ٹوٹ جائیں

نہیں تخصیص محفل میں کسی کی — مگر تاکید ہے انجم نہ آئیں

یقیناً کوئی راز ہے اس میں انجم — جو اُن کی طرف آپ کم دیکھتے ہیں

اب اُس مقامِ توجہ پہ ہے تغافلِ دوست — ضرورتاً بھی جہاں کوئی لب ہلا نہ سکے

جب نظمِ کائنات مکمل نہ ہو سکا — بڑھ کر خدائے وقت نے آواز دی "مجھے"

میری صورت میں کوئی اور سہی ہو نہ سہی — اپنی تصویر میں تم نے بھی کسی کو دیکھا؟

بلائیں تو ازل سے خانہ زادِ عشق تھیں لیکن — بہاروں کے لئے شاخِ نشیمن چھوڑ دی ہم نے
جہانِ خیر و شر میں جانے کس شے کی ضرورت ہو — سکونِ دل سے پہلے اک خلش بھی مانگ لی ہم نے

بقدرِ شوق اُٹھا تو حجابِ تنہائی — پھر اس کے بعد محبت مجھے نہ راس آئی

یہ سمجھ لیں مجھے بیگانہ سمجھنے والے! — لالہ و گل ہی نہیں، خار بھی کام آتے ہیں

سفینہ عشق کا ساحل پہ ڈوبے غیر ممکن ہے — اگر ڈوبا تو اپنے ساتھ لے ڈوبے گا ساحل کو

عشق کا عالم کیا کہئے! — جیسے کوئی نیند میں ہو

مطبوعات موصولہ

تنقیدی اصول اور نظریے یہ کتاب افسر میرٹھی کی تالیف ہے جو پہلے نقد الادب کے نام سے شایع ہوئی تھی اور اب کچھ اضافہ کے ساتھ دوبارہ انوار بک ڈپو لکھنؤ نے اسے شایع کیا ہے۔

فاضل مولف نے کوشش کی ہے کہ افلاطون کے وقت سے اس وقت تک تنقید کے جتنے نظریے قایم ہوئے ہیں ان کو پیش کر دیا جائے۔ یہ کتاب تمہید کے علاوہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ تمہید میں فن نقد پر اک عام معلوماتی بحث کی گئی ہے جو زیادہ تر مصنف کی ذاتی رائے سے تعلق رکھتی ہے، اس کے بعد نو ابواب میں تاریخی پہلو نمایاں ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مختلف ممالک و ادوار میں اس فن کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا اور اس کے کیا اصول وضع کئے گئے تھے ان ابواب میں دوسرا باب جو ہند قدیم کے سنسکرتی دور سے متعلق ہے خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے۔

اخیر کے دو ابواب میں صاحب کتاب نے مولف سے آگے بڑھ کر مصنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن میں اردو کے تمام اصناف سخن اور نئے ادیب پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان ابواب کے ذریعہ سے خود مصنف کی سلجھی ہوئی متین و سنجیدہ نقادانہ ذہنیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ نئے ادب اور آزاد شاعری کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بڑی جچی تلی رائے کی حیثیت رکھتا ہے اور ترقی پسند شعراء و ادباء کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ کتاب ۲۰۰ صفحات کو محیط ہے اور پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت [illegible] ملنے کا پتہ:۔ انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ

جھلکیاں جناب عروج زیدی بدایونی کے مجموعۂ کلام کا یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ ابتداء میں جناب دل شاہجہانپوری، جناب نوح ناروی اور جناب عرش ملسیانی کے مفصل تبصرے متعدد ارباب نقد و نظر کی مختصر رائیں شامل ہیں اور چونکہ ان سب نے عروج کے کلام کو پسند کیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا نہ ہو۔ عروج کی شاعری کا پس منظر تکنک کے لحاظ سے کلاسکل ہے لیکن جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے اس میں ہم کو بہت سی نئی باتیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً:۔

گیا قریب جو پروانہ رہ گیا جل کر — جمال خاص حدوں تک جمال ہوتا ہے

مری لغزش پہ کیا ہنسنا نظر اس پر بھی رکھ ساقی — جو اہل ہوش ہیں گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں

ایک صورت سے ہمیں تم نہیں رہنے دیتے — سرخیاں روز بدل دیتے ہو افسانے کی

عروج کی شاعری واردات دل کی شاعری ہے اور اس لئے اسے دلکش ہونا چاہئے، دوسرا حصہ منظومات قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا حسن و عشق نہیں بلکہ فکر و نظر کے بھی شاعر ہیں۔

یہ مجموعہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اور نظامی پریس بدایوں سے تین روپیہ میں مل سکتا ہے۔

صبح زنداں مجموعہ ہے جناب حسن شہیر کی نظموں کا جس پر جناب سرور نے ایک طویل تعارف سپرد قلم کیا ہے۔ ان کی رائے اس کتاب کے متعلق یہ ہے کہ "وہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جو ترقی پسند نقطۂ نظر رکھتے ہوئے اور سماجی و اجتماعی حقایق کو مانتے ہوئے اپنی انفرادی نظر اور انوکھے احساس کو نہیں چھوڑ سکتا"۔ اس سے یہ بات تو خیر ظاہر ہو ہی گئی کہ حسن شہیر ترقی پسند شاعر ہیں لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شہیر کا کلام مشاعروں اور جلسوں میں پڑھنے کی چیز نہیں۔

یہ خلوت کا چراغ ہے، اس میں گہری فکر کے ساتھ خونِ جگر کی رنگینی ملتی ہے" تنقید شعر کے متعلق سرور صاحب نے یہ بالکل نیا نظریہ پیش کیا ہے کہ جس کلام میں گہری فکر اور خونِ جگر کی رنگینی پائی جائے اسے مشہور نہ ہونا چاہئے۔ غالباً اس لئے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ پھر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "مجھے یقین ہے اس کا کہ ہمارے ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا" کیا محض اس لئے کہ وہ سمجھ سے باہر ہے، سرور صاحب نے اس جامع اضداد تعارف کے ذریعہ سے کلام شہیر کی تعریف کی ہے یا تنقیص - اس کو وہ خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

شہیر صاحب اس میں شک نہیں نہایت شدید قسم کے ترقی پسند شاعر ہیں اور نہ صرف فنی حیثیت سے بلکہ معنوی حیثیت سے وہ اس بلند مقام تک پہونچ گئے ہیں جہاں (بقول سرور) نہ صرف "اہلِ مشاعرہ وجلسہ" بلکہ ترقی پسند شعراء کی بھی رسائی نہیں اس لئے میری رائے میں یہ کتاب جدید شاعری کے ملہمات سے ہے اور الہام کی باتوں پر رائے زنی کرنا "سوءِ ادب" بھی ہے اور اپنے متعلق ناروا "حسنِ ظن" بھی۔

ضخامت ۱۰۴ صفحات، طباعت وکتابت وغیرہ نہایت پاکیزہ۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: اسرار کریمی پریس الہ آباد

پروانہ

نواب دانش عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام ہے جسے حال ہی میں مکتبۂ ادب پٹنہ نے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب جمیل مظہری کا مقدمہ یا تبصرہ نظر آتا ہے اس لئے سب سے پہلے میں نے اسی کو پڑھا، کیونکہ جمیل صاحب اس عہد کے بہترین خوشگو شعراء میں سے ہیں اور ان کی رائے کو بہت سلیم وصائب ہونا چاہئے۔

ان کی رائے ہے کہ:- "غالب وشاد کے کلام کی "باضابطہ تلاوت" نے دانش کے دماغ کو ابتدا ہی سے فلسفیانہ سانچہ میں ڈھال دیا اور اس طرح تفلسف اور تصوف ان کی شاعری کا جزوِ اعظم بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں "غمِ جاناں" کی شدت جو انفعالی تاثر پیدا کر دیتی ہے دانش کے کلام میں کہاں ملتی" جمیل صاحب نے لکھا ہے کہ "دانش کبھی کبھی لکھنوی رنگ میں بھی اُتر آئے ہیں" کیونکہ ان کے دو "ادبی رہنما" لکھنوی اسکول ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

دانش کی نظموں میں (بقول جمیل مظہری) پرویز وجوش دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے قصیدہ گوئی کی البتہ انھوں نے بہت تعریف کی ہے جس سے میں بھی متفق ہوں۔ یہ مجموعہ دو روپیہ میں مکتبۂ ادب پٹنہ سے مل سکتا ہے۔

روایت کی اہمیت

مجموعہ ہے جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے دس تحقیقی وانتقادی مقالات کا جسے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے شایع کیا ہے۔

اس مجموعہ کا نام "روایت کی اہمیت" اس لئے نہیں رکھا گیا کہ اسکے پہلے مقالہ کا عنوان یہی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس مجموعہ میں جتنے مقالات شامل ہیں ان سب میں "روایت کی اہمیت" کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے مقالہ میں انھوں نے "روایت کی اہمیت" کو ظاہر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جبکہ ترقی پسند ادیب اپنا سب سے بڑا کارنامہ یہی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ماضی کی روایات کو پس پشت ڈال دیا ہے، بڑے کام کی چیز ہے۔ آگے چل کر ڈاکٹر صاحب موصوف نے آزاد، غالب، حالی، داغ اور حسرت پر جو مقالے لکھے ہیں وہ اسی روایتی اہمیت کی مسلسل کڑیاں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلاسکل سرمایہ کو آیندہ ادبی ترقی کے لئے کس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔

عبادت صاحب دورِ جدید کے نقادوں میں سے ہیں اور ترقی پسند ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن وہ اس حمام کے اندر کپڑے اتار کر آنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ترقی پسندی کا مفہوم "قضائے مبرم" یا کوئی "ناگہاں حادثہ" نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تدریجی اصلاح سے ہے۔ وہ ماضی کی طرف سے منھ موڑ کر مستقبل کی طرف بڑھنے کے قایل نہیں اور نہ وہ تعمیر کے لئے تخریب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان مقالات میں انھوں نے اسی نظریہ کو سامنے رکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

موصوف جس مسئلہ پر لکھنا چاہتے ہیں پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح غور کر لیتے ہیں اور پھر ایک ایک کر کے ان سب کو سامنے لاتے ہیں، اس سے ان کی تحریروں میں پھیلاؤ تو یقیناً ہو جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ طلبہ کے ذہن نشین کرنے کے اس سے بہتر کوئی دوسرا طریق کار ہے بھی نہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ جدید مجموعۂ مقالات قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ہمارے جدید ادیب و شعرا خصوصیت کے ساتھ اس سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ مجموعہ (جس کی ضخامت ۲۸۴ صفحات ہے) نہایت اچھے کاغذ پر اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور سات روپیہ میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے مل سکتا ہے۔

مطالعے اور جائزے

جناب "راجندر ناتھ شیدا" کے نو انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ یہ مضامین اس سے قبل مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو چکے ہیں۔ پہلا مضمون غالب کے شاعرانہ شعور پر ہے، اس کے بعد تین مقالے اقبال سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی مضامین میں جوش، پریم چند، اصغر اور احتشام حسین کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخری مضمون رومانی شاعری پر ہے۔

شیدا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، خود سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں کسی شاعر یا ادیب کی عظمت کا انحصار اس پر ہے کہ اسے دنیا عظیم سمجھتی ہے، بلکہ وہ خود ذاتی رائے سے اس کی عظمت کا معیار قایم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک خاص قسم کا "استدلالی شعور" پایا جاتا ہے جس کا تعلق نفسیات و حقایق دونوں سے ہے۔ اور یہ معمولی بات نہیں۔ انداز بیان میں روانی البتہ نہیں ہے، لیکن یقین ہے کہ مشق و مزاولت سے یہ بات بھی پیدا ہو جائے گی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ

تحقیقی مطالعے

مجموعہ ہے جناب ڈاکٹر نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) کے چھ مقالات کا جسے خود مصنف نے شایع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فارسی کے اسکالر ہیں اور ریسرچ کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے اس وقت تک انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر قدیم شعراء و مخطوطات سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے مقالے میں انھوں نے ظہوری کے مرتبۂ شاعری کو غالب کے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غالب اور ظہوری دونوں کا نہایت غایر مطالعہ کیا ہے اس کے بعد دو مقالے ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس سے تعلق رکھتے ہیں جن میں نورس کے تمام مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت اور ابراہیم عادلشاہ کی علمی ادبی فضیلت کو نہایت وضاحت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ چوتھے مقالہ میں "گلزار ابراہیم و خوان خلیل" پر گفتگو کی ہے اور چونکہ ظہوری، ڈاکٹر صاحب کا نہایت محبوب ادیب و شاعر ہے، اس لئے اس کی تمام تصانیف پر انھوں نے بڑا گہرا ریسرچ کیا ہے۔ پانچواں مقالہ بھی اسی عادل شاہی دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں ڈاکٹر زور کی تصنیف "اردو شہپارے" پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کے درباری علماء و شعراء کے متعلق ڈاکٹر زور کے بیان میں کیا کیا تسامحات پائے جاتے ہیں۔ آخری مقالہ "معدن الشفاء سکندر شاہی" سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب سکندر لودی کے ایک وزیر سے منسوب ہے جس نے طب پر یہ معرکۃ الآرا تصنیف کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے مصنف کی تعیین اور کتاب کی اہمیت پر اس مقالہ میں بھی تحقیق و کاوش سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب فارسی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک اس کی قدر کرے گا۔

ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ: دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

...یر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات ...ری، سلاست بیان، رنگینی اور ...یلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں ...ل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے ...وط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ...ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی ...لیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ ...کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔

...ت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اُن کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ ۱۲ آنے

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین

قیمت بارہ ۱۲ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مانوین کا مذہب۔ نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

...قاب اُٹھ جانے کے بعد

...یاز فتحپوری کے تین افسانوں کا ...موعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ...ب کے بادیان طریقت و علمائے ...م کی اندرونی زندگی کیا ہے ...ران کا وجود ہماری معاشرت و ...ی حیات کے لئے کس درجہ ...قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء ...لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ...وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

...ت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری۔ جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے۔ جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (رغائب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون لطیفہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD. N. A 466

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۴۶۶

51, 53, 54

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے [illegible] کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے [illegible] معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور [illegible] کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور [illegible] "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران [illegible] فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست کے بعد وہاں کی موجودہ [illegible] زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ [illegible] بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ [illegible] لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ [illegible] مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور انکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو [illegible]

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور و قیام حیدرآباد کے زمانے کے علاوہ ان کی حیات معاشقہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرمانروایانِ اسلام نمبر) تاریخ اسلامی کا نچوڑ [illegible] ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام [illegible] حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے جو ہر لکھے پڑھے کے پاس ہونا [illegible]
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول